REGD. L. NO.7243 Phone 808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1978

اس پرچہ میں

۱ - قرآن مجید کے خلاف گہری سازش

۲ - ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی گلبرگ ۲ - لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان — ۲۴/- روپے غیر ممالک — ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۲ دو روپے

جلد ۳۱ | فروری سنہ ۱۹۷۸ء | شمارہ ۲

فہرست

(۱) لمعات ۲
(عدلیہ، قرآن و سنت کے منافی قوانین کالعدم قرار دے سکتی ہے۔)

(۲) قرآنِ مجید سمجھنے کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ ۸

(۳) قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش۔ ۹
(جو ہماری تباہیوں کا بنیادی سبب ہے)
(محترم پرویز صاحب)

(۴) ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں! ۳۷
(اس سوال کا اطمینان بخش جواب)
(محترم پرویز صاحب)

(۵) حقائق و عبر ۵۷
(۱) اقبالؒ کے خلاف زیادتی۔
(۲) سعودی عرب کی معاشرتی حالت۔
(۳) پاکستان قائم کرنے کا گناہ!
(۴) نظامِ مصطفیٰؐ کی اصطلاح کے خلاف۔
(۵) عبدالولی خان صاحب اور وحدتِ فکر۔
(۶) اس عہد کا سب سے بڑا انسان۔
(۷) شاتمِ رسولؐ اور نظامِ مصطفیٰؐ!

(۶) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں۔ ۶۳

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس۔ ۷ ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۷ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔ "قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال"۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے ملک کے طول و عرض میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں طلوعِ اسلام کے اس موقف کو (جسے یہ گذشتہ تیس برس سے برابر دھرائے چلا آ رہا ہے) بار دگر پیش کیا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کا اجرا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآنِ مجید کو قانون سازی کی اساس قرار دیا جائے، اور ہر قانون جو قرآن کے خلاف ہو، اسے کالعدم ٹھہرایا جائے۔ اِس ضمن میں ہم نے لکھا تھا کہ:-

> اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون قرآنِ مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی رو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ "سفید ہاتھی" محض دلخراشی ہنڈیاں ہیں جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ اتنے عرصہ کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ادارے بیکار محض ہیں۔ انہیں ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروّجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ جو قانون زیرِ ترتیب آئے اسے قرآنِ مجید کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارش پیش کرے ——————

لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالت عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں —————— ۔ مملکت کے ہر باشندے کو حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اس مقصد کے لئے عدالتِ عالیہ کے دروازے پر دستک دے سکے۔

بِلّٰہ الحمد کہ ہماری یہ آواز مؤثر ثابت ہوئی اور چیف مارشل لا اڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے اگلے دن اعلان کیا کہ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہر قانون کو کالعدم قرار دیدیں۔ ہمارے

نزدیک، ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کے سلسلہ میں یہ قدمِ اوّل نہایت خوش آئند ہے جس پر ہم جنرل ضیاء الحق صاحب کو مستحقِ مبارک باد سمجھتے ہیں۔ اس سے کم از کم قانون سازی کی صحیح سمت متعین ہو گئی ہے۔ مذہبی پیشوائیت "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" ہے۔ اسلامی نظام میں اس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ آپ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ پر نگاہ ڈالئے۔ اس میں کہیں مذہبی پیشواؤں کا وجود نظر نہیں آئے گا۔ قرآن مجید نے یہ کہہ کر اس طبقہ کی ضلالت آمیزیوں اور تباہ کاریوں سے متنبہ کر دیا تھا کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔ (9/34)۔ یعنی علماء و مشائخ کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مال ناحق طریق پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آیت کے آخری الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ ساری دنیا یہ سمجھتی ہے (اور علماء و مشائخ [illegible] دعویٰ کرتے ہیں) کہ یہ لوگ خدا کی طرف جانے والے راستے کی راہ نمائی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس راستہ کی طرف راہ نمائی کرنا تو ایک طرف، اس راستے میں سب سے بڑی روک خود ان کا وجود ہے۔ بنابریں، اگر ہمیں، عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں ان کا وجود نظر نہیں آتا تو یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ قرآن کریم نے اس سے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر اس طبقہ نے معاشرہ میں راہ پالی تو اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ وجہ ہے جو ہمیں اس دور میں، مذہبی پیشواؤں کا الگ وجود تو ایک طرف، مولوی ابوہریرہؓ یا مولانا ابنِ عباسؓ جیسے الفاظ تک نہیں ملتے۔ اُمت میں اس طبقہ کا وجود اس وقت پیدا ہوا جب اسلامی نظام باقی نہ رہا اور خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اسی سے دین اور سیاست میں ثنویت (جدائیگی) پیدا ہوئی۔ سلاطین اور مذہبی پیشواؤں میں سمجھوتہ ہوا۔ سیاسی امور، سلاطین نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور مذہبی امور، مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں دے دیئے۔ اس طرح مملکت میں دو اقتدار متوازی قائم ہو گئے۔ امورِ مملکت سے متعلق قوانین میں حرفِ آخر بادشاہوں کا قرار پایا۔ اور قوانینِ شریعت میں قولِ فیصل، مذہبی پیشوائیت کا۔ بہت بڑا مقام تھا جو مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہو گیا۔ یہ سلسلہ صدیوں سے برابر چلا آ رہا ہے۔ اُمت میں نہ دوبارہ، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہوئی، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہوا۔

علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکتِ پاکستان کا جو تصور دیا تھا اس سے ان کی مراد، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے قیام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مذہبی پیشوا ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف جہاد، اپنا اولین فریضہ سمجھا اور اسے عمر بھر جاری [illegible] کلامِ اقبالؒ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں سب سے زیادہ اور شدید ترین مخالفت ملاّ کی ہے [illegible] سے کوئی خاص ملا [illegible] ملاّؤں کا کوئی خاص طبقہ مراد نہیں تھا۔ اس سے ان کی مراد مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا ادارہ (INSTITUTION) تھا جو اسلامی مملکت (یا اسلامی نظام) کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ملوکیت، ملائیت اور پیریت کو مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے تھے۔ ان کے اس قسم کے سینکڑوں اشعار اس حقیقت پر دال ہیں کہ:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

تحریکِ پاکستان کی سب سے شدید مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اگر اقبالؒ کے تصور کی اسلامی مملکت قائم ہوگئی تو اس میں ان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد ان کی مسلسل کوشش ہے کہ اس میں اسلامی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ یہ بات نظر بظاہر خلافِ حقیقت (PARADOXICAL) (اور مبنی بر تعصب) دکھائی دے گی لیکن امرِ واقعہ یہی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی ثبوت یا شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ سب سے بڑی شہادت خود خدا کی ہمارے پاس موجود ہے جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ علماء و مشائخ کا وجود خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی روک ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت (۹/۳۴) میں احبار و رہبان سے مراد کسی خاص مذہب یا خاص قوم کے علماء و مشائخ نہیں۔ اس سے مراد مذہبی پیشوائیت ہے خواہ وہ کسی مذہب یا قوم کی ہو۔ تاریخِ عالم اس پر شاہد ہے کہ دنیا میں نظامِ خداوندی (دین) کے قیام کی سب سے بڑی مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی طرح قائدِ اعظمؒ نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ صحیح اسلامی مملکت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی طبقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے، فروری ۱۹۳۸ء میں، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلم لیگ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ تمہیں "مولوی اور مولاناؤں جیسے ناخوش آئند، نامطلوب عنصر (UNDESIRABLE ELEMENT) سے نجات دلا رہی ہے۔" (تقاریرِ قائدِ اعظمؒ۔ جلد اوّل۔ ص۴۲) یہ ابتدا کی بات تھی۔ انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد، بہ حیثیت گورنر جنرل، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں نہایت وضاحت سے کہا تھا کہ "کچھ بھی ہو، پاکستان میں تھیاکریسی تو کسی صورت میں قائم نہیں ہوگی"۔۔۔ یعنی قانون سازی کا اختیار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں نہیں دیا جائے گا۔

تیس برس سے ان حضرات کی یہ کوشش رہی کہ یہاں اسلامی نظام نہ قائم ہونے پائے اور قانون سازی میں حرفِ آخر انہی کو حاصل رہے۔ جنرل ضیاء الحق کے اعلان نے اس اختیار کو ان حضرات کے ہاتھ سے چھین کر، مملکت کی عدالتوں کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے۔ یہ، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے پیش کردہ تصور کی طرف قدمِ اوّل ہے جس کی رو سے (قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۳۸ء میں کہا تھا کہ) پاکستان سے مقصود، مسلمانوں کو مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم نے اس اعلان پر، جنرل ضیاء الحق صاحب کو درخورِ تہنیت قرار دیا ہے۔ اس اعلان کو قانونی شکل دینے کے لئے (معلوم ہوا ہے کہ) مسودہ تیار ہو رہا ہے۔ وہ شائع ہو جائے تو معلوم ہو سکے گا کہ اس پر عمل درآمد کس طرح سے ہوگا۔ بہر حال، یہ اصول تو طے ہو گیا کہ قانون سازی میں قولِ فیصل، مذہبی پیشوائیت کا نہیں ہوگا۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اس اعلان پر ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ مذہبی پیشوائیت اسے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کرے گی۔ وہ کوشش کرے گی کہ ان کی بالادستی کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔ چنانچہ اس کی پہلی اینٹ، مودودی صاحب کی طرف سے رکھی گئی۔ انہوں نے (اپنی مخصوص ٹیکنیک کے مطابق) اس اعلان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور نہایت معصومانہ انداز سے یہ تجویز پیش کر دی کہ ہر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ساتھ ایک ایک مفتی تعینات ہونا چاہیئے جو جج صاحبان کی راہ نمائی کرے۔ آپ اس نہایت معصوم تجویز کے مضمرات

پر غائر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ اس میں، اپنی بالادستی قائم رکھنے، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس اسکیم کو ناکام بنانے کے کیسے غیر محسوس حربے رکھ دیئے گئے ہیں۔ (مثلاً)

(۱) سب سے پہلے یہ سوچئے کہ وہ مفتی کس فرقہ کا ہوگا؛ حکومت کسی فرقہ کا مفتی متعین کرے، دوسرے فرقے اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ باہمی سر پھٹول یہیں سے شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کی ابتدا ابھی سے ہو گئی ہے۔ مفتی محمود صاحب نے تجویز کیا ہے کہ عدالتوں میں فقہ اسلامی کے ماہرین کا تقرر ہونا چاہیئے۔ (نوائے وقت، ۷ جنوری ۱۹۷۸ء) اور ظاہر ہے کہ "فقہ اسلامی" سے ان کی مراد "فقہ حنفی" ہی ہو سکتی ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت ایک بدیہی بات ہے۔ چنانچہ اس فرقہ کے ایک ترجمان، ماہنامہ محدث نے اپنی محرم ۱۳۹۸ھ کی اشاعت میں لکھا ہے کہ:-

> ایک طبقہ مقلدین کا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے مسلک کی بنیادی کتاب کو مملکت اپنے قوانین اور آئین کا ماخذ بنالے۔ چنانچہ سننے میں آیا ہے کہ وہ اس کے لئے فتاویٰ عالمگیری کا نام لے رہے ہیں حالانکہ یہ ذہن ائمہ دین کے تعامل کے خلاف ہے کہ ایک مخصوص طبقہ کے فقہی فکر و عمل کو سارے ملک پر مسلط کر دیا جائے۔ (ص۳)

(۲) اگر مختلف فرقوں کے مطالبہ کو مانتے ہوئے، ہر عدالت (یا جج) کے ساتھ ان تمام فرقوں کے مفتی صاحبان مقرر کر دیئے گئے، تو ان کے باہمد گر متضاد فتووں سے وہ (بیچارا) جج جس مصیبت میں پھنس جائے گا، ظاہر ہے۔ اوّل تو وہ کسی فیصلہ پر پہنچ ہی نہیں سکے گا۔ اور اگر اس نے اپنی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ دے دیا، تو جن فرقوں کے خلاف وہ فیصلہ جائے گا وہ "مردہ باد" کہتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج (مسٹر جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس) نے کہیں کہہ دیا کہ جج صاحبان کے ساتھ، مفتیوں کی تعیناتی کی ضرورت نہیں۔ وہ صاحبِ بصیرت بھی ہوتے ہیں اور اسلامی قانون کے ماہر بھی۔ اس پر ان کے خلاف لے دے شروع ہو گئی۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء کے نوائے وقت میں ایک مفتی صاحب (جمیل احمد نقاوی) کا ایک شعلہ بار مضمون شائع ہوا ہے جس میں پہلے تو (جسٹس بدیع الزمان کے) اس مشورہ کو "یورپ سے مرعوب دماغ کی اختراع" قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بعد کہا ہے کہ:-

> حکومت نے قانون بنا دیا ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان ہر اس قانون کو جو قرآن و سنت کے خلاف ہوگا کالعدم قرار دیں۔ تو ایسے اہم ترین کام کے لئے کسی واقعی واقفِ کار کی شرکت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ..... فرض کر لیجئے کہ وہ لوگ (بقول ریٹائرڈ جج صاحب) ماہر بھی ہیں اور عمل بھی اس کے خلاف نہیں کر رہے ہیں۔ تو آخر ایک مددگار شریکِ کار سے گھبراہٹ کیوں؟ یہ کچھ ان سطور کی تسوید تک ہمارے سامنے آیا ہے ــــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

لیکن اس سلسلہ میں اصل سوال پر غور کرنا ابھی باقی ہے ــــــ اعلان یہ ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ "قرآن و سنت" کے خلاف قوانین کو کالعدم قرار دے دے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی عدالت کسی ایسے قانون کے مطابق فیصلہ دیتی ہے، نہ دے سکتی ہے، جو مدون شکل میں اس کے پاس نہ ہو۔ (مثلاً) وہ فوجداری یا دیوانی مقدمات کا فیصلہ،

ضابطہ فوجداری یا ضابطہ دیوانی میں مندرج قوانین کی رو ہی سے دیتی ہے۔ "قرآن و سنت" کی اصطلاح میں قرآن تو ایک مدون ضابطہ (کتاب) ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ لیکن کیا عالمِ اسلام میں کوئی ایسی کتاب بھی موجود ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر، سنتِ رسول اللہؐ تسلیم کرتے ہوں؟ ہم تیس سال سے حضرات علماء کرام سے یہ سوال کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس کا جواب کفر کے فتوؤں کے سوا کچھ نہیں مل رہا۔ مودودی صاحب کو ہمارے مسلسل تقاضوں سے زِچ آ کر، بالآخر اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ قرآن و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ یعنی انہوں نے تسلیم کر لیا کہ ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہؐ تسلیم کر لیں۔ اس کا اعتراف بھی کیا، اور اب جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اعلان کیا کہ قرآن و سنت کے خلاف قوانین کو کالعدم قرار دے دیا جائے تو وہ اس پر جشنِ مسرت بھی منا رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جشنِ مسرت کس بات پر منایا جا رہا ہے؟ اس بات پر کہ جب عدلیہ بھی، قرآن و سنت کی رو سے ایسے قوانین بنانے میں ناکام رہ جائے گی جنہیں تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، تو یہ بات مسلّمہ طور پر سامنے آ جائے گی کہ اب دنیا میں اسلام کی بنیادوں پر کوئی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی مملکتوں میں یہی نظام رائج رہنا چاہیئے کہ شخصی قوانین مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہیں اور حکومت، ملکی قوانین جس طرح جی چاہے وضع کر لے۔ اس کو سیکولر نظام کہتے ہیں۔ (جو بھارت میں بھی رائج ہے) اور یہی مودودی صاحب (اور ان کے ساتھ ان علماء) کا دلی مقصود ہے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مودودی صاحب اس احساس کی بنیاد پر موجودہ اعلان پر خوشیاں منا رہے ہیں۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا ——— اور خدا کرے کہ ہمارا یہ اندازہ درست ثابت ہو ——— عدالتِ عالیہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری پوری کوشش کرے گی۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ سعادت جو ان کے حصے میں آ رہی ہے ایسی متاعِ قلیل نہیں جو وہ اس سے، اتنی آسانی سے اپنے آپ کو محروم کر لیں۔ آج تک ان کا فریضہ اتنا ہی رہا ہے کہ مجلسِ قانون ساز جس قسم کے قوانین وضع کر دے، وہ ان کے مطابق فیصلے دیں۔ لیکن اب ان کے سپرد یہ فریضہ ہوا ہے کہ وہ خلافِ اسلام قوانین کو مسترد کر دیں۔ (ظاہر ہے کہ اس طرح ملک میں کوئی قانون بھی خلافِ اسلام نہیں رہے گا)۔ یہ بڑی عظیم ذمہ داری اور ایسی خوش بختی ہے جس پر وہ جس قدر بھی فخر و ناز کریں، کم ہے۔ اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انتہائی جد و جہد کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے انہیں سب سے پہلے وفاقی وزارتِ قانون یا اسلامی نظریاتی کونسل سے یہ کہنا چاہیئے کہ وہ انہیں سنتِ رسول اللہؐ پر مشتمل ایسی جامع کتاب مہیا کریں جسے تمام فرقے اسی طرح متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہؐ تسلیم کریں جس طرح وہ قرآنِ مجید کو خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ عدلیہ کے فیصلوں کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہونا ہے۔ (ان میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوگی)۔ اس لئے اس قسم کی کتاب کی موجودگی ان کے لئے لاینفک ہے جس کے بغیر وہ یہ اہم فریضہ سرانجام نہیں دے سکیں گے۔ اگر ہماری عدلیہ اس قسم کی کتاب مرتب کرانے میں کامیاب ہو گئی تو ہماری ساری تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکے گی اور ان کا یہ کارنامہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہوگا۔

لیکن اگر وزارتِ قانون یا نظریاتی کونسل اس قسم کی کتاب مہیا نہ کر سکی (اور نظر آتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکے گا) اور اس کے باوجود عدلیہ نے اسلامی قوانین کی تدوین اپنا فریضہ سمجھا تو ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ وہ اس چیز کو اپنے فیصلوں کی بنیاد قرار دیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یعنی خدا کی کتاب، قرآنِ عظیم۔ لیکن اس کے لئے وہ جرأت درکار ہوگی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

اس سوال کا جواب (کہ کیا کوئی مملکت آج بھی اسلامی بن سکتی ہے)۔ یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

حسبنا کتاب اللہ۔

جنرل ضیاء الحق صاحب نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا کہ قانون سازی میں حرفِ آخر بننے کا اختیار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں سے چھین کر عدلیہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اگر عدلیہ دوسرا قدم اٹھائے اور حسبنا کتاب اللہ کہنے کی جرأت کرے تو جس مقصدِ عظیم کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ پورا ہو جائے گا بلکہ اقوامِ عالم، ایک بار پھر اس زمین پر اس جنت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی جسے آسمان کی آنکھ نے چودہ سو سال پہلے دیکھا تھا اور جسے دیکھنے کے لئے وہ آج تک چکر کاٹ رہا ہے ——— یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو ——— ہمارا دل تو کچھ یوں کہہ رہا ہے کہ فطرت اس کے لئے راستے ہموار کر رہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت جس شور و شغب سے پچھلے سال کی تحریک میں ہنگامہ آرا ہوئی تھی، کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس کے ہاتھ سے وہ قانونی اتھارٹی بھی چھن جائے گی جس کی وہ صدیوں پر پھیلے ہوئے دورِ ملوکیت میں واحد اجارہ دار بنے چلی آ رہی تھی۔ فطرت کے انداز اپنے ہی ہوتے ہیں۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ۔ (۲۷/۵۰)

وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور ہم (خدا) اپنی ان تدبیروں کو بروئے کار لا رہے تھے جو اُن کے سان گمان میں بھی نہیں تھیں۔

رات کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے سورج نے، آخر الامر طلوع ہونا ہی ہوتا ہے۔ انسانیت، مذہبی پیشوائیت سے تنگ آ چکی ہے۔ یہ اکثر و بیشتر اقوام کے ہاں ختم ہو چکی ہے۔ جہاں باقی ہے، حالتِ نزع میں ہے اور اس کی فساد انگیزیاں رقصِ بسمل۔ اس کے خاتمہ پر اسلام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ ضوفشاں ہوگا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

آئندہ ماہ (مارچ) کے شمارہ میں ایک جامع مقالہ شائع ہوگا۔ جس میں تفصیل سے بتایا جائے گا کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے راستے میں کون حائل ہے۔ (ناظم ادارہ)

قرآنِ مجید کے سمجھنے کی راہیں ہموار ہوگئیں

قرآنِ مجید کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ:-

(۱) یہ معلوم ہو کہ عربی مبین کی رُو سے قرآنی الفاظ کے صحیح معانی کیا ہیں۔ اور

(۲) قرآنِ کریم نے مختلف موضوعات کے متعلق کس کس جگہ، کیا کیا کہا ہے۔

یہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ان معانی کو متعین کر سکے اور ان تمام مقامات کو یکجا کر دے۔ یہ مشکل، مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے چالیس، پچاس سال کی محنتِ شاقہ سے، ہمارے لئے حل کر دی۔ انہوں نے پہلے:-

لغات القرآن مرتب فرمائی، جس میں قرآنِ مجید کے الفاظ اور اصطلاحات کے معانی نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ قیمت مکمل سیٹ ایک سو روپیہ — اس کے بعد انہوں نے، انہی معانی کی روشنی میں:-

مفہوم القرآن مرتب کیا جس میں الحمد سے والناس تک پورے قرآنِ مجید کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ بجائے خویش ایک مربوط اور مفصل کتاب کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اسے بلاک میں چھاپا گیا ہے اور تیس پاروں کے مکمل سیٹ کی قیمت ایک سو بیس روپے ہے۔ ویسے یہ الگ الگ پاروں میں بھی دستیاب ہے — پھر انہوں نے:-

مطالب الفرقان کے عنوان سے، قرآنِ مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ شروع کیا جس میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خدا کی یہ عظیم کتاب کس طرح اپنی تفسیر آپ کرتی ہے۔ اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور تیسری زیرِ ترتیب ہے۔ جلد اوّل چالیس روپے اور جلد دوم پچاس روپے میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد، ان کی عمر بھر کی کوہکنی اور خارہ شگافی کا وہ شاہکار سامنے آیا جس کی مثال قرآنی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ یعنی:-

بتویب القرآن، جو حال ہی میں تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں قریب اڑھائی ہزار عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت ان آیات کے حوالے درج ہیں جن میں اس عنوان سے متعلق قرآن میں کچھ آیا ہے۔ اس سے ہر موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی تعلیم بیک وقت سامنے آجاتی ہے۔ اس بحرِ ذخّار (کا مکمل سیٹ) ایک سو ساٹھ روپے میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت ہمیں خدشہ تھا کہ اس زمانے میں، اس قسم کی، اور اتنی گراں قیمت کی کتاب کی مانگ زیادہ نہیں ہوگی، لیکن دو ہی ماہ میں اس کی جس قدر فرمائشیں موصول ہوئی ہیں، اور جس تیزی سے موصول ہو رہی ہیں، ان سے نظر آگیا کہ پرویز صاحب کی شب بیداریاں رائگاں نہیں گئیں۔ قوم میں قرآن کا ذوق بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے قرآن فہمی کی راہیں ہموار کر دی ہیں اور اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم قرآن کو کیسے سمجھیں۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

مندرجہ بالا اور پرویز صاحب کی دیگر تصنیفات کے ملنے کا پتہ:-

(۱) مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ب گلبرگ ۲ لاہور

مفصل فہرست کے لئے ایک کارڈ لکھیئے — والسلام

باسمہ تعالیٰ

ذَالِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش

جو ہماری تباہیوں کا بنیادی سبب ہے

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

قرآن مجید کے خلاف گہری سازش

قرآنِ مجید میں ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ۔ (۲۰/۵۰)۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کی تخلیق کی اور پھر اس کی راہ نمائی اس منزل کی طرف کر دی جو اس کی خلقت کا منتہیٰ ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ: اَلَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۔ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَھَدٰی ۔ (۸۷/۲-۳) اس نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے، اس میں اعتدال پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے ایسے قوانین و ضوابط مقرر کر دیئے جن کے اتباع سے وہ اپنی تخلیقی منزل (DESTINATION) تک پہنچ سکے۔ یعنی اس منزل تک اس کی راہ نمائی خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے ہوتی ہے۔ ان (اور ان جیسی متعدد دیگر) آیات سے واضح ہے کہ اشیائے کائنات کو (جن میں انسان بھی شامل ہیں) راہ نمائی عطا کرنا، خدا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ راہ نمائی ہر شے کے اندر ودیعت کر دی گئی۔ اسے جبلت یا (INSTINCT) کہتے ہیں۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، یہ راہ نمائی اس وحی کی رو سے عطا کی گئی جو حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچائی گئی۔ اس وحی کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی اور اس کی تکمیل حضور خاتم النبیین (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف نازل کردہ کتاب (قرآن مجید) میں۔ اس کتاب میں دی گئی وحی کے متعلق فرمایا کہ: وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ۔ خدا نے انسانی راہ نمائی کے لئے جو قوانین دینے تھے وہ اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گئے۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۔ (۶/۱۱۶) اب ان میں نہ تو کسی حک و اضافہ کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی تبدیلی کی حاجت۔ مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ قوانینِ خداوندی۔ چونکہ اس ضابطہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ ہدایت قرار دیا گیا تھا اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خدا نے خود اپنے اوپر لے لیا...... فرمایا کہ: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۔ (۱۵/۹) یقیناً ہم ہی نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی پوزیشن ——— تمام نوعِ انسان کے لئے، خدا کی طرف سے آخری۔ مکمل۔ غیر متبدل۔ محفوظ ضابطۂ ہدایت۔

قرآنِ کریم میں عطا کردہ راہ نمائی، انسان کی پوری زندگی اور اس کے ہر گوشے کو محیط ہے لیکن اگر ہم اس کی اصل و اساس کو چند الفاظ میں سمٹا کر بیان کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ایک تمہیدی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہوگا۔

انسانوں کے دو طبقے

اور وہ تمہیدی حقیقت یہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ایک فرد دوسرے فرد سے الگ۔ ایک نسل دوسری نسل سے جدا، اور ایک قوم دوسری قوم سے مختلف نظر آتی ہے لیکن اگر نوعِ انسان کی تاریخ پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو شروع سے آج تک انسانیت دو ہی طبقوں میں بٹی ہوئی ملے گی۔ ایک طبقہ وہ جو محنت اور مشقت کر کے کماتا ہے اور دوسرا وہ جو اُن کی محنت کے ماحصل کو غصب کر کے لے جاتا، اور مفت میں عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس تفریق سے باہمی مفادات میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس ٹکراؤ کا نتیجہ فساد انگیزی اور خوں ریزی ——— خواہ یہ افراد میں ہو۔ گروہوں میں ہو یا قوموں میں۔ یہی نوعِ انسان کی بنیادی (PROBLEM) ہے، اور خدا کی وحی اس پرابلم کا حل بتاتی ہے۔ اس وحی کی رُو سے ایسا نظام یا ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس کے اساسی اصول یہ ہیں کہ: لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹)۔ محنت کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ اور فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا۔ (۲۰/۱۱۲) اور محنت کرنے والے کو نہ کسی قسم کی بے انصافی اور دھاندلی کا ڈر ہوگا اور نہ ہی اس کی محنت کے ماحصل کو کوئی ہضم کر سکے گا۔ قرآنِ کریم نے اسی پروگرام کو پیش کیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ان دو مصرعوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ جب کہا کہ :–

چیست قرآں؛ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ (جاوید نامہ)

قرآن کیا ہے؛ ہر قسم کے استحصال کرنے والوں (EXPLOITERS) کے لئے موت کا پیغام۔ اور ہر مظلوم، بیکس اور بے بس کا حامی اور مددگار! ——— اب ظاہر ہے کہ مفاد پرستوں کا ہر گروہ اس قسم کے انقلاب آفریں نظام کی بشدت سے مخالفت کرے گا اور اپنا پورا زور لگا دے گا کہ وہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کے پیش کردہ نظام کی جس شدت سے مخالفت ہوئی اس کی تفاصیل قرآن مجید میں شرح و بسط سے مذکور ہیں۔ یہ مخالفت انفرادی تصادمات سے لے کر جنگ کے میدانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ ان کوششوں میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے مفاہمت (COMPROMISE) کی کوششیں شروع کر دیں۔ مفاہمت کی شرط کیا تھی؟ یہ کہ: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ۔ وہ کہتے تھے کہ تم اس

مفاہمت ناممکن ہے

قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵) اس میں ہماری منشاء کے مطابق تبدیلیاں کر دو۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب کیا تھا؛ یہ کہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ نہ اس قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی جا سکتی۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۔ (۶۸/۹) وہ نبی اکرمؐ سے کہتے کہ کچھ آپ اپنے مقام سے ہٹیں، کچھ ہم اپنے مطالبہ میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس طرح باہمی مفاہمت ہو سکے گی۔ اور اس کا جواب یہ تھا کہ اپنے مقام سے باطل ہٹا کرتا ہے۔ حق نہیں۔ اسی لئے حق اور باطل میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کی دعوتِ توحید کی تھی جس کا عملی مفہوم تھا خالص کتاب اللہ کی اطاعت۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس میں کچھ انسانوں کے خودساختہ قوانین بھی شامل کر لئے جائیں۔ قرآن کے الفاظ میں ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔ جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ اس کے قبول کرنے سے

انکار کرتے ہیں .... اور جب اس کے ساتھ انسانی قوانین ملا دیئے جائیں تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) قانون۔ حکم۔ حکومت۔ فیصلہ صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ اسی کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور کا حکم شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (۱۲/۴۰) یہی قائم رہنے والا محکم نظامِ حیات ہے۔ اس میں ذرا سا بھی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ ان سے پوچھو کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ (۲۹/۵۱) یہ کتاب جسے میں پیش کر رہا ہوں، اس میں کس بات کی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے تم اس میں انسانی آمیزش ضروری سمجھتے ہو۔

حضورؐ نبی اکرم نے، ان مفاد پرست گروہوں کی مخالفت، اور مفاہمت کی کوششوں کے علی الرغم قرآنِ خالص کی بنیادوں پر نظامِ خداوندی قائم کر کے دکھا دیا۔ اسی کو الدّین یا الاسلام کہا جاتا ہے۔ اس سے ان مفاد پرستوں کے دل پر جو گذری ہوگی، ظاہر ہے، اس زمانے میں تو وہ کچھ نہ کر سکے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے سر ابھارا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ امتِ مسلمہ کا یہ نظام قرآنِ خالص کی اطاعت سے قائم ہے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ تھی کہ قرآن اس امت کی زندگی کا ضابطہ نہ رہے۔ صدرِ اول کے بعد ہماری ساری تاریخ ان مفاد پرستوں کی انہی کوششوں کی داستان ہے اور ان کوششوں میں ان کی کامیابی، ہمارا المیہ۔ صحبتِ امروزہ میں میں اس داستان کی مختصر سی جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو مفاد پرست گروہوں کی متعدد قسمیں ہو سکتی ہیں، لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حکمرانوں کا گروہ۔ نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کا طبقہ اور مذہبی پیشوائیت۔ قرآنِ کریم نے فرعون۔ قارون اور ہامان کے حوالے سے انہی کا تعارف کرایا ہے۔ اُمت کی نگاہوں سے قرآنِ خالص کو اوجھل کرنے کے لئے، حکمران اور سرمایہ پرست طبقہ، براہ راست کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس فریضہ کو مذہبی پیشوائیت ہی سرانجام دے سکتی تھی۔ اس لئے اول الذکر دونوں گروہ ان کی پشت پناہی کرتے رہے اور یہ گروہ سرگرمِ عمل رہا۔ ان کی ٹیکنیک بڑی لطیف اور عمیق تھی۔ قرآنِ کریم نے، اپنے افتتاحیہ (سورۃ فاتحہ) کے بعد، پہلی سورۃ میں کہا ہے کہ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں۔ یعنی یہ خود ایک کتاب ہے اور اس کے مندرجات سب کے سب حق و صداقت پر مبنی ہیں۔ قرآنِ مجید کے اس سب سے پہلے دعویٰ سے واضح ہے کہ اس سے وہی شخص یا وہی قوم راہ نمائی حاصل کر سکتی ہے جسے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ جسے اس میں کسی قسم کا بھی شبہ پیدا ہو جائے وہ اس سے راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا، اس گروہ کی ٹیکنیک یہ تھی کہ قرآنِ کریم میں مختلف نوعیتوں کے شبہات پیدا کئے جائیں۔ دیکھئے، اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کیا کیا، کیا؟

قرآنِ مجید پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ:۔

(۱) اللہ تعالےٰ نے اسے وحی کے ذریعے نبی اکرمؐ پر نازل کیا۔

(۲) نبی اکرمؐ نے اسے بعینہٖ دوسرے انسانوں تک پہنچایا۔ اور جس شکل میں یہ آج ہمارے پاس موجود ہے، اسی شکل میں امت کو دیا۔ اس میں ایک حرف تک کا بھی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ یہ خدا کی مکمل۔ غیر متبدل اور محفوظ کتاب ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ اس گروہ نے، اس حقیقت میں شبہ پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا۔ واضح رہے کہ جو کچھ میں اس سلسلہ میں کہوں گا وہ سب ہماری ان کتبِ احادیث میں موجود ہے جنہیں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی صحاح ستہ اور ان پر مشتمل کتب تفسیر میں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انہوں نے قرآنِ مجید کے جمع اور مرتب کرنے کے سلسلہ میں کس قسم کے افسانے وضع کئے۔

جمع القرآن کی روایات مختلف کتبِ احادیث میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن انہیں امام ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "کتاب المصاحف" میں یکجا کر دیا ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابوداؤدؒ کے صاحبزادہ ہیں۔ وہ ۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ ان کی یہ کتاب علماءِ حدیث کے ہاں مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس میں جمع القرآن کے متعلق کیا لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:-

قرآن کیسے جمع ہوا

(حضرت) زیدؓ بن ثابت سے روایت ہے کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہوا۔ (حضرت) ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں (حضرت) عمرؓ بھی موجود تھے۔ (حضرت) ابوبکرؓ کہنے لگے کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لیں۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا۔ بخدا! یہ کام اچھا ہی ہے۔ اور اس بارے میں مجھ سے برابر کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرحِ صدر کر دیا تھا، میرا بھی شرحِ صدر کر دیا۔ اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو ان کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہؐ کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا، تم قرآن کو لکھ لو۔ زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کا شرحِ صدر ہو چکا تھا، میرا بھی شرحِ صدر ہو گیا چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم..... چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورت میں لکھ دیا۔

ضمناً، کتاب المصاحف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کو درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور حضرت زیدؓ بن ثابت نے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ نیز یہ بھی کہ جمع القرآن کا کام درحقیقت حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن ثابت نے کہا تھا کہ انہیں ایک آیت نہیں مل سکی تھی، لیکن کتبِ احادیث

میں کچھ اور بھی لکھا ملتا ہے۔ اسے غور سے سنئے۔ حضرت ابیؓ بن کعب سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ:۔

حضرت زرؓ بن حبیش نے کہا ہے کہ مجھ سے حضرت ابیؓ بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورہ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی بہتر (۷۲) تہتر (۷۳)۔ (جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں)۔ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ سورۂ احزاب میں سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ آیات) ان میں ایک آیۂ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔

(الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵)

آیۂ رجم کے ساتھ کیا ہوا

آیۂ رجم کے متعلق سننِ ابن ماجہؒ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) کہا گیا ہے کہ جب قرآنِ کریم مرتب کیا جانے لگا، تو صحابۂ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت "رجم" سے متعلق تھی اور دوسری "رضاعت" سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

آیۂ رجم اور آیۂ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہٰذا، ان دونوں آیتوں کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہم آیۂ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں آپ بھی اس آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے تو آپ اسے قرآنِ حکیم میں درج کیوں نہیں کر دیتے۔ آپ نے فرمایا:۔

میں اس آیت کو قرآن میں بلاشبہ درج کر دیتا لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن میں اضافہ کر دیا۔ (تفسیر کبیر از امام رازی نیا ایڈیشن۔ جلد   صفحہ ۱۳۴)

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے۔ لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ زنا کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے تو اس کی سند یہی ہے۔

جمع القرآن کے متعلق، جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اسے ہمارے علماء اور مفسرین آج تک صحیح مانتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت قرآنِ پاک کو جس حالت میں چھوڑا، وہ یہ تھی کہ، اپنی مکمل اور مرتب صورت میں وہ صرف ان حافظوں کے سینے میں محفوظ تھا، جنہوں نے حضورؐ سے سیکھ کر از اوّل تا آخر، یاد کیا تھا۔ تحریری شکل میں آپ نے اس کا ——— لفظ لفظ لکھوا ضرور دیا تھا مگر وہ متفرق پارچوں پر۔ تختیوں۔ کھجوروں کی چھالوں۔ شانے کی ہڈیوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا جو ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضورؐ نے اسے سورتوں کی ترتیب

کے ساتھ ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۵ و نومبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۲)

ضمناً، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق، جو شروع ہی میں فرمایا ہے کہ: ذالک الکتٰب لاریب فیہ، تو مودودی صاحب کی اس تحقیق کی رو سے "کتاب" سے مراد وہ تھیلا تھا جس میں قرآن کے منتشر اجزا کو بند کیا گیا تھا!۔ یاللعجب!

بہرحال، یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق روایات کی رُو سے، قرآن کو جمع کیا گیا۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح جمع شدہ قرآن کا نسخہ حضرتِ عثمان رضؓ کے زمانے تک محفوظ تھا اور اسی سے انہوں نے دیگر نسخے نقل کرا کر مختلف شہروں میں بھیجے تھے۔ لیکن مودودی صاحب کی، اس بارے میں تحقیق کچھ اور کہتی ہے ـــــ ان کا ارشاد ہے کہ:۔

قرآنِ مجید درحقیقت سات[7] زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسول اللہؐ نے بھی قرآن کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا، لیکن حضرتِ عثمانؓ نے ان میں سے صرف

چھ زبانوں والے قرآن تلف کر دیئے گئے

ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا تاکہ اُمت میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہ ہی رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۹ و نومبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۳)

مودودی صاحب کی اس تحقیق کی رُو سے، آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ حضرتِ عثمان رضؓ نے جس قرآن کو باقی رکھا اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ امت میں متواتر چلا آ رہا ہے، اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ جن نسخوں کو (بقول مودودی صاحب) حضرت عثمان رضؓ نے ضائع کر دیا تھا، وہ سب منزل من اللہ تھے۔ اب کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کیا لکھا تھا؟

بہرحال، مصحفِ عثمانی کے متعلق کتاب المصاحف میں کہا گیا ہے کہ:۔

جب (حضرت) عثمانؓ نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا، (کہ قرآن کو جمع کر دیا) مگر اس میں مجھے کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن عرب انہیں اپنی زبانوں سے درست کر لیں گے۔

اسی کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجاج ابن یوسف نے اپنے زمانے میں حضرتِ عثمان رضؓ کے مصحف میں گیارہ[11] جگہ پر تبدیلیاں کیں اور یہی قرآن آگے چلا۔

صحابہ رضؓ کے مختلف مصاحف

کتاب المصاحف میں (روایت کی سند کے ساتھ) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت عثمان رضؓ نے قرآن مجید کا نسخہ مرتب کیا تو مختلف اکابر صحابہ رضؓ کے پاس اپنے اپنے نسخے تھے جن میں بے شمار آیات، ان آیات سے مختلف تھیں، جو مصحفِ عثمانی

ہیں درج تھیں۔ اس مقام پر، یہ واضح کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب المصاحف کو ایک مستشرق، آرتھر جیفری (ARTHUR JEFERY) نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اور وہ تمام آیات درج کر دی ہیں جو (روایات کی رو سے) مختلف صحابہ رضؓ کے نسخوں میں تھیں اور جو مصحفِ عثمانی میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ ان نسخوں میں مختلف فیہ آیات کی تعداد حسبِ ذیل بتائی گئی ہے۔

(۱) حضرت ابنِ مسعودؓ (۱۳۲۲ آیات) ز (۲) حضرت ابیؓ بن کعب (۹۵۲) ز (۳) حضرت علیؓ (۸۹) ز (۴) حضرت ابنِ عباسؓ (۱۸۶) ز (۵) حضرت ابوموسیٰؓ (۴) ز (۶) حضرت حفصہؓ (۱۰) ز (۷) حضرت انسؓ بن مالک (۲۴) ز (۸) حضرت عمرؓ (۲۸) ز (۹) حضرت زیدؓ بن ثابت (۱۰) ز (۱۰) حضرت ابنِ زبیرؓ (۳۴) ز (۱۱) حضرت عائشہؓ (۱۳) ز (۱۲) حضرت سالمؓ (۲) ز (۱۳) حضرت امِ سلمہؓ (۱۴) ز (۱۴) اور حضرت عبیدؓ ابن عمیر (۱۸)۔

واضح رہے کہ یہ اختلافات محض لب و لہجہ کے نہیں تھے بلکہ بعض جگہ آیتوں کی آیتیں، اور اکثر مقامات پہ الفاظ کے الفاظ ایک دوسرے سے بدلے ہوئے یا کم و بیش تھے۔ یہ تمام تفاصیل روایات میں موجود ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمان رضؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے، بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔

نقطوں اور اعراب کے بغیر

اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی :-

كٮٮ احكمٮ اٮٮه ٮم ڡصلٮ مں لدں حكىم حٮىر (۱۱/۱)

(ترجمان القرآن - بابت جون سنہ ۱۹۵۹ء)

اس طرح قرآنِ کریم کی کتابت کا نتیجہ کیا تھا، اس کے متعلق انہوں نے لکھا ہے :-

اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال بامعنی بنا کر ہی پڑھتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رُو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے، وہاں خود اہلِ زبان کو بھی، بکثرت التباسات پیش آجاتے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ لکھنے والے کا منشا کیا تھا۔ (ایضاً)

اس کے بعد آپ غور فرمائیے کہ قرآنِ مجید کے متعلق اعتماد کیا باقی رہ سکتا ہے اور یقین کیا؟ عربی زبان کا ایک ابجد خواں بھی اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے کہ نقطوں اور اعراب کے بغیر اس زبان کی کسی عبارت کے معانی بھی یقینی طور پر متعین نہیں کئے جاسکتے اور محض نقطوں اور اعراب کے اختلاف سے اس کے معانی میں کس قدر اختلاف ہو سکتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن پر اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرہ کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر تھا۔ اس نے ابوالاسود سے فرمائش

کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط اور بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کیا اور ابوالاسود کے طریق کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر۔ زبر۔ پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج تک مستعمل ہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ نومبر ۵۹ء۔ صـ ۲۹)

مودودی صاحب کے اس بیان سے واضح ہے کہ جو قرآنِ مجید اُمت میں مستعمل ہے اس کے نقطے اور اعراب، عراق کے غیر معروف دو عالموں کی صوابدید کے رہینِ منت ہیں۔ انہی کے مطابق قرآنی آیات کے معانی متعین کئے جاتے ہیں۔ کیا معلوم کہ جو قرآن اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا تھا اس کی آیات کے معانی کیا تھے؟ بالفاظِ دیگر مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق، سات زبانوں کے جو قرآن خدا نے نازل کئے تھے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآن حضرت عثمانؓ نے تلف کر دیئے۔ جو ایک باقی رہا، اس پر معانی متعین کرنے کی علامات (نقطے اور اعراب) عراق کے دو عالموں نے تجویز کیں! اس کے بعد سوچئے کہ موجودہ قرآن کی حیثیت کیا رہ گئی؟

(ضمناً) طلوعِ اسلام نے اسی زمانے میں دو تین مبسوط مقالات شائع کئے جن میں مستند طور پر یہ بتایا کہ مودودی صاحب نے قرآنِ مجید میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش میں، خود اپنے آپ کو عربی زبان اور اس کی تاریخ سے کس قدر ناواقف ثابت کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۵۹ء و فروری، ۱۹۶۱ء و اکتوبر ۱۹۷۰ء) ان مقالات میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عربی زبان میں ابتدا ہی سے نقطے موجود تھے، اور قرآنِ مجید کے الفاظ پر اعراب بھی۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ روایات کی رُو سے، مختلف صحابہؓ کے پاس، قرآنِ کریم کے ایسے نسخے موجود تھے جن میں ایسی آیات درج تھیں جو مصحفِ عثمانی میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ آپ شاید خیال کرتے ہوں کہ یہ اختلافات اسی زمانے میں ختم ہو گئے ہوں گے کیونکہ قرآنِ کریم کا جو نسخہ امت میں متواتر چلا آ رہا ہے، اس میں یہ اختلافی آیات موجود نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں یہ اختلافی آیات موجود نہیں۔ لیکن ان اختلافی آیات کو اب بھی، منزل من اللہ آیات مانا جاتا ہے۔ آپ نے تفاسیر میں اکثر لکھا دیکھا ہوگا کہ قراءتِ حضرتِ ابنِ عباسؓ میں یوں آیا ہے:" اور اس کے بعد اختلافی آیت لکھی ملتی ہے۔ "قراءتِ حضرتِ ابنِ عباسؓ" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مصحف میں یہ آیت یوں لکھی ہوئی تھی۔ ان قراءتوں کے اختلاف کی

اختلافِ قراءت

دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد، جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے:۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ..... (۴/۲۴)

اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں، اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو، نکاح میں لاکر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے، جس کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو۔

سنیوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کر کے دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت ایک مدتِ معینہ کے لئے مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ———— اس عورت کو جنسی اختلاط کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سنیوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ سنیوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ —— ان کی قرأت میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے:-

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ....

تم ان میں سے ایک مدتِ معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرأت کی رو سے، آیتِ قرآن میں إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اس اضافہ کے متعلق حضرتِ ابن عباسؓ نے کیا کچھ فرمایا ہے؟ اس کی تفصیل سنیوں کی سب سے پہلی اور قابلِ اعتماد تفسیر طبری میں لکھا ہے:-

ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابنِ عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا، کیوں نہیں۔ کہا، پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فاستمتعتم بہ منھن الی اجل مسمٰی۔" میں نے کہا۔ نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا اچھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالعلی کی روایت میں بھی ابونضرہ سے اس طرح کا واقعہ منقول ہے۔ تیسری روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ فاستمتعتم بہ منھن —— ابن عباسؓ نے کہا: الی اجل مسمٰی۔ میں نے کہا۔ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا۔ "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے۔

(۲) متعہ کے علاوہ شیعہ اور سنی میں ایک اختلاف وضو کے متعلق بھی ہے۔ سنی وضو میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ اس باب میں مودودی صاحب کی تفسیر غور طلب ہے۔ وضو کا حکم سورۃ المائدہ کی آیت ۶ میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵/۶)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم اُٹھو نماز کے لئے تو دھوؤ اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک، اور مسح کرو اپنے سروں پر اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

یہ آیت درج کرنے کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

اس میں لفظ وارجلکم کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت وَاَرْجُلَكُمْ (بفتح لام) ہے اور ابن کثیر۔ حمزہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرأت وَاَرْجُلِكُمْ (بکسر لام) ہے۔ ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشاء کے مطابق الفاظ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں۔ بلکہ یہ دونوں قرأتیں متواتر طریقے سے منقول[1] ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو ارجلکم ـــــ کا تعلق فَاغْسِلُوْا کے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں۔ "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں۔ "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔ (ترجمان القرآن۔ بابت فروری ۱۹۵۹ء)

ظاہر ہے کہ ان دو قرأتوں کی رو سے قرآن کریم میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ یعنی وہ پاؤں دھونے کا بھی حکم دیتا ہے اور مسح کرنے کا بھی۔ حالانکہ اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ (۴/۸۲) لیکن مودودی صاحب ان دونوں قرأتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جن کی رو سے قرآنی حکم میں بالبداہت تضاد واقع ہو جاتا ہے۔

اختلافِ قرأت کا یہ عقیدہ بھی ہمارے ہاں مسلمہ ہے۔ (واضح رہے کہ ہم نے اس بحث میں شیعہ حضرات کے عقائد کا ذکر قصداً نہیں کیا ورنہ ان کے ہاں "الکافی" میں متعدد ایسی آیات درج ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مروجہ قرآن کی یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی۔ یعنی ان کے عقیدہ کی رُو سے، آیاتِ قرآنی میں اختلافِ قرأت ہی نہیں بلکہ صریحاً تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً زیرِ نظر آیت نازل تو اَرْجُلِكُمْ ہی ہوئی تھی لیکن اس میں تحریف کرکے مصحفِ عثمانی میں اسے اَرْجُلَكُمْ درج کر دیا گیا)۔

اختلافِ "قرأت" (یا بالفاظ صریح تحریف فی القرآن) کی یہ مثالیں احکام سے متعلق تھیں۔ اب ایک ایسی مثال دیکھئے جس سے دین کی اصل و بنیاد تک ہل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے مامورین من اللہ کے لئے رسول یا نبی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ سورۂ حج کی آیت ۵۲ (۲۲/۵۲) میں ہے :-

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۲۲/۵۲)

(اے رسول!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے چلے جانے کے بعد دین کے دشمنوں نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔

---

[1] مودودی صاحب نے پہلے کہا کہ ابتداء میں قرآن کریم کی جس طرح کتابت ہوئی اس میں الفاظِ قرآنی پر اعراب نہیں تھے۔ اگر صورت یہ تھی تو ارجلکم کے ل زبر اور زیر کی تفریق کس طرح کی گئی تھی اور یہ دونوں قرأتیں کس طرح منقول ہوئی تھیں۔

جب ایسا ہوتا تو خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کی اس آمیزش کو دور کر کے اپنے قوانین کو محکم بنا دیتا۔ اسلئے کہ خدا علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔

اس آیت سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے رسول یا نبی آتے تھے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کی قرأت میں یہ آیت یوں آئی ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث ..... الخ۔ یعنی اس میں رسول اور نبی کے ساتھ مُحَدَّث (دَ کے زبر کے ساتھ) کا اضافہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے رسول۔ نبی اور محدث آیا کرتے تھے۔

محدّث کا عقیدہ

میں نے اپنے اس مقالہ میں شیعہ حضرات کے عقیدہ اور مسلک کے متعلق بحث نہیں کی لیکن چونکہ زیرِ نظر آیت میں اضافہ کا تعلق اصولاتِ دین سے ہے اس لئے اس باب میں ان کی ایک روایت کا ذکر ناگزیر ہے۔ کتاب الکافی شیعہ حضرات کا احادیث کا معتبر ترین مجموعہ ہے۔ اس میں عقیدۂ محدث کے سلسلہ میں حسبِ ذیل روایت درج ہے۔

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیۂ کان "رسولاً نبیاً" کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبی وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اس کی آواز سنتا ہے لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا۔ اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے۔ خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا امام کی منزلت کیا ہے؟ فرمایا وہ فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ۔

(الکافی کا اردو ترجمہ الشافی۔ جلد اوّل۔ ص۲۰۳۔ شائع کردہ شمیم بک ڈپو۔ کراچی)

اصولِ کافی (عربی) میں اس روایت کے تحت حاشیہ میں لکھا ہے۔ انما ھو فی قرأت اھل بیت علیھم السلام (جلد اول ص۱۷۶) یعنی اہلِ بیت کی قرأت میں اس آیت میں "ولا محدث" کے الفاظ آئے ہیں۔

اس سے اگلی روایت میں ہے:۔

محدث وہ ہے جو ملائکہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ان کا کلام سنتا ہے لیکن اسے دیکھتا نہیں، اور نہ اسے خواب نظر آتا ہے۔ (الشافی۔ جلد اول۔ ص۲۰۴)

اس کے بعد ایک روایت میں ہے کہ:۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "میں اور میرے صلب میں سے گیارہ امام محدث ہیں"۔

(الشافی۔ جلد اوّل۔ ص۲۸۱) [1]

ختمِ نبوت کا عقیدہ اسلام کا اصل الاصول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے جو کچھ دینا تھا وہ حضور نبی اکرمؐ کی طرف نازل کردہ وحی میں تکمیل تک پہنچ گیا اور قرآنِ مجید کی دفتین میں

---

[1] میں نے اس بحث کو اپنی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح حضورؐ کے بعد، خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا آپ آخری نبی اور رسول ہیں۔ میرزا غلام احمد (قادیانی) نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس پر سخت اعتراضات ہوئے تو انہوں نے کہا:

آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلعم) اس اُمت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس اُمت میں بھی پہلی اُمتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے۔ اور محدث، بفتح دال وہ لوگ ہیں جن سے معاملات و مخاطباتِ الٰہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباسؓ کی قرأت میں آیا ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث...... (آخر تک) پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے، محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔

(براہینِ احمدیہ۔ شائع کردہ انجمن احمدیہ اشاعتِ اسلام۔ لاہور صفحہ ۳۴۸ حاشیہ در حاشیہ)

آپ دیکھئے کہ میرزا صاحب نے وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث کو "آیت" کہا ہے یعنی مروجہ قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی۔ وہ بھی قرآن کی آیت ہے۔ اور " ولا محدث" کے اضافہ کے ساتھ بھی قرآن کی آیت ہے۔

اس (ولا محدث کے اضافہ والی) آیت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

ہمارے سید الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اس لئے شریعت میں نبی کے قائمقام محدث رکھے گئے ہیں[1]　　(شہادت القرآن۔ صفحہ ۲۸)

نبی کے قائم مقام ——— محدث!

آپ نے دیکھا کہ اختلافِ قرأت کا باطل عقیدہ بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اسے صحیح مانا جاتا ہے۔

ان مثالوں سے (جو بکثرت موجود ہیں) یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم اس شکل میں بھی نازل ہوا تھا جو مروجہ نسخوں میں ہے اور ان شکلوں میں بھی جو مختلف قرأتوں میں موجود ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآنِ مجید کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے!

اب آگے بڑھئے۔ مروجہ قرآنِ کریم (معاذاللہ) جیسا تیسا بھی ہے اس کے متعلق ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا ——— اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی بے شمار آیات ایسی ہیں جو صرف تلاوت کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ نہیں کہا کہ فلاں آیت ناسخ ہے اور فلاں آیت

---

[1] میرزا صاحب کے دعاوی کی حقیقت کے متعلق، میری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" دیکھئے۔

ناسخ و منسوخ

منسوخ - اس پر آپ متعجب ہوں گے کہ پھر اس بات کا فیصلہ کس نے کیا کہ فلاں آیت منسوخ ہے ——— اس کا فیصلہ محدثین نے کیا - مفسرین نے کیا - علماء نے کیا - فقہاء نے کیا - یعنی انہیں یہ اتھارٹی حاصل ہو گئی کہ وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ آیات کو منسوخ قرار دے دیں - کسی زمانے میں اس قسم کی منسوخ شدہ آیات کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچتی تھی - پھر یہ گھٹتے گھٹتے شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں پانچ تک رہ گئی - لیکن پانچ سو ہوں یا پانچ، یہ عقیدہ اب بھی موجود ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور وہ صرف تلاوت کے لئے باقی ہیں - مثلاً مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن، جلد اوّل (۱۹۵۱ - ایڈیشن) میں روزے سے متعلق آیت (۲/۱۸۳) کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ :-

> ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ، جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں - بعد میں، دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی - (صفحہ ۱۴۱)

"یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی" مودودی صاحب کا اپنا فیصلہ ہے - اللہ تعالےٰ نے نہ پہلے رعایت دی، نہ بعد میں اسے منسوخ کیا - خدائے علیم و خبیر اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ ایسے احکام دے جنہیں خود ہی بعد میں منسوخ کرنا پڑے -

اس سے بھی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس عقیدے کے بعد، آیاتِ قرآنی کی محکمیت کے متعلق کس قدر یقین باقی رہ سکتا ہے ؟

ناسخ اور منسوخ کے متعلق یہی عقیدہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت کو خود قرآن ہی کی دوسری آیت منسوخ کر سکتی ہے بلکہ یہ عقیدہ بھی رائج کیا گیا کہ قرآنی آیات کو احادیث بھی منسوخ کر سکتی ہیں - اس پر جب یہ اعتراض

وحی کی دو قسمیں

وارد ہوا کہ وحی کو غیر وحی کس طرح منسوخ کر سکتی ہے ؟ تو کہا گیا کہ وحیٔ خداوندی ساری کی ساری قرآنِ مجید کے اندر ہی درج نہیں - اس کا بہت تھوڑا حصہ قرآن میں ہے اور کثیر حصہ احادیث میں - چنانچہ جمعیتِ اہلِ حدیث کے سابق صدر، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) اپنی کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں لکھتے ہیں :-

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے - اور فی الحقیقت اس انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا ..... جبرائیل قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے - آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے - اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں -

یعنی جو وحی قرآن میں درج ہے اور جو احادیث میں درج ہے، دونوں اللہ تعالےٰ کی طرف سے، حضرت جبرائیل کی وساطت سے رسول اللہ کو ملی تھیں اور دونوں کا درجہ اور مقام ایک ہی ہے - مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) کے الفاظ میں "جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریح کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے

خروج کے مرادف۔" (ایضاً)

مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔

(تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۳۳۶)

اس سوال کے جواب میں، کہ وحی کو ان دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مقصد کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اگر پوری کی پوری وحی کو قرآن کریم میں درج کر دیا جاتا تو:

قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر، ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ (ایضاً۔ ص ۳۳۷)

ضمناً، لگے ہاتھوں آپ یہ بھی دیکھتے جائیے کہ یہی مودودی صاحب جو یہ فرماتے ہیں کہ وحی ہونے کی جہت سے قرآن اور حدیث میں کوئی فرق نہیں، دوسرے مقام پر، اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ وہ ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں:۔

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف سٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانے میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہے کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

اس سے یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ مودودی صاحب نے، یہ متضاد باتیں کیسے کہہ دیں۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے تو یہ مودودی صاحب کے متعلق آپ کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ان کے ہاں تو قریب قریب ہر مسئلہ میں اس قسم کے تضادات موجود ہوتے ہیں۔ ان کا عام معمول یہی ہے۔

ہم، بہرحال کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم کے متعلق، ایک عقیدہ یہ بھی وضع کیا گیا کہ وحیٔ خداوندی، ساری کی ساری قرآن ہی میں درج نہیں۔ وحی کا معتدبہ حصہ احادیث میں درج ہے۔ اسی لئے احادیث کو "مثلہ معہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کی مثل اس کے ساتھ۔ یہ الگ بات ہے کہ "مثلہ معہ" کے مجموعے ہر فرقے کے الگ الگ ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رو سے بات کیا بنی؟ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعتراضات کے جواب میں کہا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱) کیا وہ کتاب جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کے لئے کافی نہیں" جو یہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی چاہتے ہیں؟ قرآن مجید سے الگ اور خارج، دوسری وحی کے عقیدہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی کتاب انسانی راہنمائی

کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ، اس کی مثل (مثلہ معہٗ) کچھ اور کی بھی ضرورت تھی جسے اس دوسری وحی نے پورا کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اب قرآنِ مجید کو انسانی راہ نمائی کے لئے کافی سمجھنے والوں کے متعلق کیا کہا جاتا ہے؟

میرا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانی راہ نمائی کے لئے جو کچھ عطا کرنا تھا وہ اصول و اقدار (اور بعض معاملات میں احکام) کی شکل میں قرآن کریم میں مکمل طور پر موجود ہے۔ اس طور پر قرآن مجید، انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کے اتباع میں، ان اصول و اقدار کی روشنی میں جزئی قوانین وضع کرے۔ اس مسلک کی بنا پر مجھے منکرِ حدیث اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ یعنی میرا جرم یہ ہے کہ

حسبنا کتاب اللہ

میں حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے) کیوں کہتا ہوں[1]۔ یہ الفاظ (حسبنا کتاب اللہ)۔ میرے نہیں۔ یہ حضرت عمرؓ کے ہیں جو انہوں نے نبی اکرمؐ کی وفات سے چند روز قبل ارشاد فرمائے تھے حسبنا کتاب اللہ کہنے کی وجہ سے میرے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے والوں سے، شیعہ حضرات نے ایک بڑی چبھتی ہوئی بات کہی ہے۔ (جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) شیعہ حضرات کی احادیث کی کتاب الکافی کا الشافی کے نام سے اُردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مقدمہ میں فتنۂ انکار حدیث کے عنوان سے کہا گیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ بایں ہمہ مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ حدیث کی افادیت کا منکر ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ـــــ ایں دفترِ بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ ـــ اس فتنہ کا حجرِ اساس تو پیغمبرِ اسلام کے آخری لمحات میں آنجناب کے مطالبہ قلم و دوات کے جواب میں حسبنا کتاب اللہ (بخاری شریف) طبع مجتبائی۔ دہلی جلد ۲۔ ص ۶۳۸۔ مشکوٰۃ۔ ص ۵۸۴۔ طبع اصح المطابع دہلی) کہہ کر کر دیا گیا تھا۔ اور اپنی حسبنا کتاب اللہ کے قائل کے دورِ خلافت میں حدیث بیان کرنے والوں کو دُرے لگتے تھے۔ (الفاروق شبلی نعمانی۔ طبع غلام علی اینڈ سنز۔ ص ۲۴۷)

یہ نظریۂ فاسدہ اسلام کے مختلف ادوار سے گذر کر مولوی چکڑالوی اور مسٹر پرویز[2] کے وقت برگ و بار لے آیا۔ اب جبکہ اپنے اصلی رنگ و روپ اور حقیقی خدوخال کے ساتھ منظرِ عام پر ظاہر ہوا ہے تو حسبنا کتاب اللہ کے قائل بھی چلّا اٹھے ہیں اور اس خیال کے ابطال پر متعدد کتب و رسائل لکھ ڈالے ہیں، مگر ان حضرات کو یہ کون سمجھائے کہ ـــــ اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست! اور خود کردہ را علاجے نیست! (مقدمہ صفحہ ب/۳)

مطلب واضح ہے۔ یعنی سُنی حضرات۔ آج حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں کے خلاف تو کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں

---

[1] علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس ارشادِ فاروقیؓ کو اسلام کے احیاء کے لئے شرطِ اوّل قرار دیا ہے۔

[2] مولوی عبداللہ چکڑالوی یا فرقہ اہلِ قرآن کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں ان کے مسلک کے سخت خلاف ہوں، اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

لیکن جس نے (یعنی حضرت عمر فاروقؓ نے) اس فتنہ کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اسے خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں!

یہ حضرات عام طور پر، کہتے ہیں کہ ہم اسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ ماہنامہ "فکر و نظر" کی دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھا گیا کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔

حدیث پرکھنے کا معیار

اس پر جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان الاعتصام (لاہور) نے سخت احتجاج کیا اور اپنی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں لکھا:۔

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے جتنی بڑی شہرت پذیر ہے، اسی قدر یہ بڑا جھوٹ ہے جو رسول اللہ کے ذمے لگایا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ کی طرف منسوب کی گئی، اسی دور میں ماہرینِ فنِ حدیث ائمۂ کرامؒ نے ببانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسول نہیں بلکہ یہ عبارت زنادقہ (گمراہ لوگوں) کی وضع کردہ ہے۔ چنانچہ چوتھی صدی کے نامور فقیہہ و محدث امام خطابیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للفتنی۔ ص۲۸۔ و مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی کی ظفر الامانی صفحہ ۲۶۷ نیز جامع بیان العلم لابن عبدالبر جلد ۲ صفحہ ۱۹۱)

بات واضح ہے۔ یعنی جب، ان حضرات کے عقیدہ کی رو سے، حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے تو اس کے مطابقِ قرآن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر

حدیث کی اسی حیثیت کی رو سے، یہ ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کو بھی احادیث کی رو سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی آیاتِ قرآنی کی وہی تفسیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو احادیث کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں ہم بیسیوں روایات پیش کر سکتے تھے جن سے معلوم ہو جاتا ۔۔۔کہ روایات کس قسم کی تفسیر پیش کرتی ہیں۔ ہم صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ قرآنِ کریم میں شرح و بسط سے بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کیا کرتے تھے۔ ان واقعات کو سامنے لاکر اللہ تعالےٰ نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (حضرت) موسےٰؑ کو اس قدر تنگ کیا تھا۔ قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بخاری شریف میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے۔

ابوہریرہ رضؓ نبی صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک، دوسرے کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اور موسےٰ علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے ... تو

بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ موسےٰ ؑ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسےٰ ؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرتِ موسےٰ ؑ بھی اس کے تعاقب میں، یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "ثوبی یا حجر، ثوبی یا حجر" اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، اے پتھر! میرے کپڑے دیدے۔ یہانتک کہ بنی اسرائیل نے موسےٰ ؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ موسےٰ ؑ کو کچھ بیماری نہیں ہے .... (اور پتھر ٹھہر گیا) موسےٰ ؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم (حضرتِ موسیٰ ؑ کی مار سے) اس پر چھ یا سات نشان (اب تک باقی) ہیں۔

(بخاری جلد اول اُردو ترجمہ صفحہ ۷۶)

۲۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے متعلق ہے ــــ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ۔ (۵۷/۳) یعنی خدا زمان (TIME) کی قیود سے ماورا ہے۔ یہ ایسی صاف اور واضح بات ہے جس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ــــ وہی اول وہی آخر ہے ــــ لیکن حدیث کی کتاب ترمذی میں حضرتِ عباس رضؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:-

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) یا تہتر (۷۳) سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے ــــ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

غالباً قرآنِ کریم کی اس آیت کی بھی تفسیر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷) یہ آیت ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے۔ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰) "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا" یعنی پانی مدارِ حیات ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا امکان نہیں۔ اور عرش کے معنی اقتدار کے ہیں۔ لہٰذا، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کی اساس و بنیاد پر خدا کا کنٹرول ہے۔ آپ آیت کے اس مفہوم کو دیکھئے اور اس کے بعد اس روایت کو جو اوپر درج کی گئی ہے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کیا اس تفسیر کسی صورت میں بھی نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟ لیکن جو ایسا کہے، اُسے رحدیث اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ حجر میں ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ۔ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۔ (۱۵/۲۴-۲۵)

اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں اور تیرا رب انہیں اکٹھا کرے گا۔ وہ حکمت والا علم والا ہے۔

اکٹھا کرنے کے ضمن میں دوسری جگہ کہا ہے :-

مَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ - (۵۶/۵۱)

یعنی پہلے اور پچھلے متعین دن کی میعاد پر جمع کئے جائیں گے۔

آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو جو پہلے ہو گزرے ہیں، اور انہیں جو آنے والے ہیں میدانِ حشر میں جمع کرے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ روایات کی رُو سے ان آیات کی تفسیر کیا ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابنِ عباس رضؓ کی روایت ہے کہ :-

ایک حسین ترین عورت مسجد میں رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ رضؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں۔ لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اسے جھانکتے رہتے تھے اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

ہم اِن روایات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے قرآنِ کریم کی تفسیر صحیح ہے جو روایات میں بیان کی گئی ہے، آپ کو اندازہ ہو جائے کہ وہ تفسیر کس قسم کی ہے۔ آپ سوچئے کہ ان روایات کو کسی صورت میں بھی رسول اللہ ص کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کتب احادیث کی روایات ہیں جنہیں مسلمہ طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا ہے اور جن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ انہیں بھی جبرائیلِ امین، قرآن کی طرح، خدا کی طرف سے لے کر نازل ہوتے تھے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ اس قسم کی حدیثوں کو (جو اپنی زبان سے اعلان ہیں کہ وہ وضعی ہیں۔ وہ حضور ص کے ارشادات نہیں ہو سکتے) ان کتابوں میں یوں رہنے دیا جا رہا ہے انہیں کیوں احادیثِ نبوی ص تسلیم کیا جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کی وجہ غور سے سمجھنے کے قابل احادیث کو وحی قرار دینے والوں میں ایک گروہ (اہل حدیث کا) وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ (کم) بخاری اور مسلم کی تمام حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو دائرۂ اسلا سے خارج کر دیتا ہے۔ اس وقت ہم ان کے اس عقیدہ سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں ان کے ہاں اس کی گنجائش نہیں کہ جس حدیث کو چاہے صحیح قرار دے دیں اور جسے چاہے غلط یا وضعی قرار دے کر اسے مسترد کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ، صرف اہلِ حدیث ہی نہیں، باقی فرقوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے احادیث کے مختلف مجموعوں میں جس قدر احادیث ہیں ان کی چھان پھٹک پہلے سے ہو چکی ہے اور ان میں مزید تنقید و تفحص کی گنجائش نہیں۔ ان مجموعوں میں جن احادیث کو صحیح قرار دیا جا چکا ہے وہ صحیح ہیں، جنہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے، وہ ضعیف ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا مسلک ان سب سے الگ ہے۔ وہ احادیث کی اس تقسیم و تفریق کو، پہلے سے چلی آ رہی ہے، قابلِ قبول تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس

کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی متقدین حدیث) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۹)

مزاجِ شناسِ رسول

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک، حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہے۔ سنیئے اور غور سے سنیئے.... فرماتے ہیں:۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے...... جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہؐ کا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ ...... یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۴-۳۲۳)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کا کوئی خارجی معیار نہیں۔ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسولؐ کی نگاہِ بصیرت پر موقوف ہے۔ جسے وہ صحیح کہہ دے، وہ صحیح۔ جسے وہ غلط قرار دے دے، وہ غلط!.... مودودی صاحب کے متبعین انہیں امام مالکؒ۔ امام حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، اللہ کا شاہکار اور دورِ حاضر کا عظیم ترین انسان قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے سوا مزاج شناسِ رسولؐ کون ہو سکتا ہے؛ وہ مودودی صاحب کو مزاج شناسِ رسولؐ قرار دیتے ہیں۔

اس سے آپ دیکھ لیجئے کہ مودودی صاحب نے اپنے لئے کس قدر گنجائش پیدا کر لی ـــ کہ جس حدیث کو وہ اپنے مفیدِ مطلب سمجھیں اسے قولِ رسول اللہؐ قرار دے کر، وحی خداوندی اور سند اور حجت قرار دے دیں۔ جسے اپنے مقصد کے خلاف سمجھیں اسے مسترد کر دیں۔ اس کے بعد دیکھئے کہ وہ اپنے اس مسلک سے کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

انہوں نے جب جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی تو ملک کے بعض اربابِ علم و فضل نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے مسلک میں تبدیلی کی۔ حصولِ اقتدار کو اپنا مقصود قرار دیا، اور جائز و ناجائز جو کچھ حصولِ اقتدار کے لئے کرنا پڑتا ہے، وہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر ان کی جماعت کے ممتاز ترین ارکان نے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ جماعت سازی کے زمانے میں آپ جو بلند و بالا اصول پیش کیا کرتے تھے، اب

آپ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور کذب و افترا تک سے بھی گریز نہیں کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان اعتراضات کے جواب میں انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے اصول شکنی کی ہے اور کذب و افترا سے کام لیا ہے، تو کونسا خلافِ اسلام کام کیا ہے۔ (معاذ اللہ۔ صدبار معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مثلاً:-

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کرکے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی[1] لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ: الائمۃ من قریش - "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ سستا ایڈیشن۔ ص ۳۰-۳۲۹)

"الائمۃ من قریش" کی روایت کے وضعی ہونے کے لئے کسی لمبے چوڑے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ (جیسا کہ خود مودودی صاحب نے اعتراف کیا ہے) یہ قرآن مجید کی اصولی تعلیم کے بھی خلاف ہے اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے بھی خلاف۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کو اپنی اصول شکنی کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے کے لئے سند درکار تھی، اس لئے وہ اس روایت کو بالکل صحیح قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت! "مزاج شناسِ رسول" کی نگاہِ بصیرت کا فیصلہ!!

اب ان کے رفقاء کے دوسرے اعتراض کی طرف آیئے۔ یعنی جھوٹ بولنے کے اعتراض کی طرف۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ:-

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دے دیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد (غیرتِ ناموسِ رسالتؐ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے) دھڑلے سے فرمایا کہ:-

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ ص ۵۵-۵۴)

ان مثالوں سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حضرات اس قسم کی روایات کو، جو بالبداہت وضعی ثابت ہوتی ہیں، مسترد کیوں نہیں کرتے! یہ روایات ان کی اصول شکنیوں اور دروغ بافیوں کو عین مطابقِ اسلام قرار

---

[1] یعنی حضورؐ نے مساوات قائم کرکے نہیں دکھائی۔ قائم کرنے کی کوشش فرمائی!

دینے کے لئے سند کا کام دیتی ہیں۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ کوئی روایت بھی ہو، اسے قرآن مجید کے معیار پر پرکھ لینا چاہیئے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اسے صحیح تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اگر اس کے خلاف جائے تو اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ چونکہ اس کے معیار کی رو سے ان حضرات کے لئے اصول شکنیوں اور کذب تراشیوں کی گنجائش نہیں رہتی اس لئے وہ ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ اس کی بات کوئی نہ سنے۔ اور اس ڈھنڈورے کو اس شد و مد سے پیٹتے ہیں کہ قرآنی معیار کی بات اس شور و شغب میں دب کر رہ جاتی ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس سے حضورﷺ نبی اکرم کی سیرتِ طیبہ کس قدر داغدار ہو کر دنیا کے سامنے آتی ہے تو اس سے انہیں کیا غرض؟

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور اسے محرّف اور انسانی راہ نمائی کے لئے ناقص اور ناکافی قرار دینے کے لئے کیا کیا سازشیں ہوئی ہیں، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ہم نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق اربابِ شریعت سے ہے۔ یعنی راویانِ حدیث، جامعینِ حدیث محدثین، مفسرین اور فقہا۔ ان کا تعلق شریعت سے ہے۔ دوسرا طبقہ اصحابِ طریقت یعنی صوفیاء کرام کا ہے۔ جنہیں اولیاء اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کے متعلق وہ، اربابِ شریعت سے کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق، متعدد مقامات پر اور نہایت وضاحت سے بتایا کہ یہ لسانِ عربیٍ مبین کی کتاب ہے۔ یعنی اسے نہایت واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہو، وہ اس زبان کی رو ہی سے سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن اربابِ طریقت کا یہ ارشاد ہے کہ اس کتاب کے الفاظ

باطنی معانی

کے جو معانی ہیں، یہ ان کی رُو سے نہیں سمجھی جا سکتی۔ ہر لفظ کا ایک باطنی مفہوم ہے جو اس لفظ کے اندر چھپا ہوا ہے اور جو ظاہری علم کی رُو سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس کے لئے باطنی آنکھ کی ضرورت ہے۔ باطنی معانی کا عقیدہ یہودیوں نے وضع کیا تھا۔ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زھّاد میں ہے کہ:۔

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے۔

ان باطنی معانی کے متعلق تاکید تھی کہ ان کا علم، خواص تک محدود رہے۔ عوام ان پر مطلع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ یہودیوں کی روایات کی کتاب مشنا میں لکھا ہے کہ:۔

> کتابِ پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دینی چاہیئے اور کتاب حزاقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ہمارے اربابِ تصوف نے یہ عقیدہ تو یہودیوں سے لیا لیکن اس کی سند کیلئے اس قسم کی حدیثیں وضع کر لیں کہ:۔

> حضرتِ ابوہریرہ رضؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہﷺ سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک (علم ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے لیکن اگر میں دوسرے (علم باطنی) کو ظاہر کر دوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی

جائے۔ (بخاری باب العلم)

یہ باطنی معانی کس قسم کے ہوتے ہیں اس کی توضیح و تشریح کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو زمرۂ صوفیاء کا سرخیل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ "وحدت الوجود" کے عقیدہ کے علمبردار ہیں۔ اس عقیدہ کا ملخص یہ ہے کہ انسان اور جملہ کائنات میں سے کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ یہ سب خدا ہی خدا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں کہ:-

فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ کیونکہ وہ ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (معاذ اللہ)!

ان کے بیان کردہ باطنی معانی کی مثال دیکھئے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔ (۲۰/۵۵) اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔" ابنِ عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:-

ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور پھر دوبارہ نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

یعنی ان کے نزدیک ارض (زمین) کے باطنی معانی ذاتِ خداوندی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک قرآنِ کریم کے الفاظ کے باطنی معانی کس قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہیں ان معانی کا علم خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ اسے وہ علمِ لدنی یا کشف و الہام کہہ کر پکارتے ہیں۔ باطنی معانی کی رو سے قرآنِ کریم کو کس طرح مسخ کر دیا جاتا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستورالعمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستورالعمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء "وحدت الوجود" تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ صـ۳۵)

اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا:-

جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (ایضاً صـ۴۴)

یہ ہے جو ارباب طریقت نے قرآنِ مجید کے ساتھ کیا۔

سورۂ توبہ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کا مال ناجائز طریق پر کھا جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں، روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، قرآن کریم نے (سورۂ فاتحہ کے بعد) پہلی سورت کی پہلی آیت میں (الم کے بعد) کہا ہے کہ: ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۔ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شبہ اور ریب و تشکیک کا شائبہ تک نہیں اور یہ سفرِ حیات میں ان لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے جو بلا خوف و خطر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہیں۔ اس آیۂ جلیلہ سے یہ واضح ہے کہ قرآنِ کریم اسی صورت میں کتابِ ہدایت بن سکتی ہے جب اس کے متعلق یقینِ کامل ہو کہ اس کا ایک ایک لفظ منزل من اللہ ہے اور جس شکل میں وہ آج ہمارے پاس موجود ہے، رسول اللہؐ نے اسے اسی شکل میں اُمت کو دیا تھا۔ اس میں کسی لفظ کا تو ایک طرف، نقطے اور اعراب تک میں، کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور نہ قیامت تک ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اگر اس حقیقت میں ذرا سا بھی شک پیدا ہو جائے تو قرآنِ مجید سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس کتاب میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کیسی منظم سازش کی گئی ہے۔ جو کچھ ہم نے اس باب میں لکھا ہے، آپ علماء حضرات میں سے کسی سے پوچھ لیجئے کہ سند کے اعتبار سے اس میں کسی قسم کی غلطی ہے؟ اس سازش کی ٹیکنیک یہ ہے کہ جو کچھ اس باب میں کیا یا کہا گیا، اسے منسوب کر دیا اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف، جو رسولِ امینؐ تھے اور جنہوں نے منزل من اللہ وحی کا ایک ایک لفظ کامل امانت اور دیانت کے ساتھ، نوعِ انسان تک پہنچا دیا۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ اس ضمن میں حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ سب وضعی ہے اور اُس سازش کا نتیجہ جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

میری عمر کا حصۂ اوّل شریعت اور طریقت کی انہی وادیوں میں گزرا ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے متعلق جو کچھ کہتا ہوں وہ شنید نہیں، دید ہے۔ اور اسی لئے میں جو کچھ کہتا ہوں سند کے ساتھ کہتا ہوں۔ ان وادیوں سے نکلنے کے بعد، مبداءِ فیض کی کرم گستری سے مجھے قرآنِ کریم کے سمجھنے کی توفیق عطا ہوئی اور اسی سے مجھ پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ——— خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) کس طرح روک بن کر کھڑے ہو جاتے

احبار و رہبان

ہیں؛ غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات، خدا کی طرف لے جانے والے راستہ کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے قرآنِ کریم سے جو بصیرت حاصل کی، اس سے میں نے اپنا یہ فریضہ سمجھا کہ قرآنِ کریم کو اُمت کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے جو جو پردے لٹکائے گئے ہیں، میں انہیں ہٹانے کی امکان بھر کوشش کروں۔ ظاہر ہے کہ احبار و رہبان پر اس قسم کی کوشش بڑی ناگوار گزرتی ہے اور ان کی طرف سے اس کی مخالفت بالکل فطری امر ہے۔ بایں ہمہ، ان میں ایسے

خوش بخت حضرات بھی ہو گزرے ہیں جنہیں اس کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنی عمرِ گزشتہ کے ضائع ہو جانے پر بڑے تاسف کا اظہار کیا۔ مولانا سید محمد انور شاہ (مرحوم) علماءِ دیوبند میں بلند ترین مقام رکھتے تھے۔ ان کی آخری زندگی کا ایک عبرت آموز واقعہ، مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی زبانی ماہنامہ میثاق کی نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ وہ اس قابل ہے کہ اس پر انتہائی تدبر سے غور و فکر کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گذار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا، اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا "حضرت کیسا مزاج ہے؟"

کہا "ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!"

فرمایا "میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا "حضرت بات کیا ہے؟"

فرمایا "ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا، خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا"

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں اور امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے، اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو..... "خطاء محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں"

پھر فرمایا:۔

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کونسا مسلک صواب تھا، اور کونسا خطاء..... اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا

ترکِ رفع یدین حق تھا؛ آمین بالجہر حق یا بالسر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔"

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:۔

"اللہ تعالےٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا، نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصّے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سُنّت کا نور پھیلانے میں گذریں۔ اللہ تعالےٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا۔ یا اس کے برعکس یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی، اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی — آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار اُن کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں، اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں، ان فرعی و فروعی بحثوں میں!"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔

"یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔"

شیخ الہند مولانا محمود الحسن (مرحوم) کا مقامِ بلند بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ پر مفتی محمد شفیع (مرحوم) ہی کے حوالے سے، ان کا ایک واقعہ درج ہے جو اسی طرح غور و فکر کا متقاضی ہے شیخ الہند (مرحوم) نے فرمایا:۔

> میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

میں نے اپنی زندگی کا یہی مقصد قرار دے رکھا ہے اور گذشتہ چالیس سال سے قرآنِ کریم کی تعلیم اور پیغام کے عام

کرنے میں مصروفِ جد و جہد ہوں۔ اس جد و جہد کا ماحصل یہ ہے :-

۱۔ جو شخص قرآنِ کریم کو من جانب اللہ سمجھتا ہے اس کے لئے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو قرآن اُمت میں متواتر چلا آ رہا ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے حضور نبی اکرمؐ پر وحی فرمایا اور جسے حضورؐ نے اُمت کو دیا۔ اس لئے کہ جس شخص کا ایمان ہو کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اسے اس حقیقت میں ذرا سا بھی شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ اس باب میں شکوک و شبہات کے طومار کھڑے کر دئے گئے ہیں، اس لئے میں نے سب سے پہلے اس حقیقت کو وا شگاف کیا کہ قرآنِ کریم خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں اسی شکل میں مرتب اور مدون ہو چکا تھا جس شکل میں وہ اُمت کے پاس متواتر چلا آ رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل، میری کتاب "آسمانی کتابوں کی کہانی" کے آخری باب میں ملے گی۔

۲۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ اس نے قرآنِ مجید کو لسان عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ بنا بریں قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں، عرب، قرآنی الفاظ کا مفہوم کیا سمجھتے؟ اس مقصد کے لئے میں نے پورے قرآنِ مجید کا ایک ضخیم لغت مرتب کیا جو لغات القرآن کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے اپنا مطلب "تصریفِ آیات" کی رُو سے واضح کیا ہے۔ یعنی اس سے ایک موضوع کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ فلاں مسئلہ، حکم، موضوع کے متعلق قرآنِ مجید کے کس کس مقام پر کیا آیا ہے۔ اس سے قرآن اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے "تبویب القرآن" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہے۔ یہ کتاب قریب ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اور تین جلدوں میں حال میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ لغات القرآن اور تصریفِ آیات کی روشنی میں، میں نے پورے قرآنِ مجید کا مفہوم مرتب کیا جو مفہوم القرآن کے نام سے تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ اسی طریق کے مطابق میں مختلف عنوانات سے، قرآنِ کریم کی تعلیم کو نہایت شرح و بسط سے پیش کرتا چلا ہوں۔ میری متعدد تصانیف ——— مثلاً ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ انسانیت۔ جہانِ فردا۔ کتاب التقدیر وغیرہ اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان کے بعد میں نے قرآن مسلسل تفسیر کا سلسلہ شروع کیا ہے جس کی دو جلدیں "مطالب الفرقان" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں تیسری جلد زیرِ تسوید ہے۔ ان تصانیف سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے مفہوم کو بیان کرنے، مطالب کو سمجھانے کے لئے خارجی سہاروں کا محتاج نہیں۔

میری ان تمام کاوشوں کا منتہیٰ و مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اس حقیقت کو عام کر دوں کہ :-

۱۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے اور اسلامی مملکت کا آئین و دستور۔

۲۔ دنیا میں حق و باطل کا معیار۔ غلط اور صحیح کی میزان۔ خیر اور شر کے پرکھنے کی محک۔ ہر دعویٰ کی صداقت کی سند، خدا کی کتاب ہے۔ حدیث بھی وہی صحیح ہے جو اس کتاب کے مطابق ہو اور تفسیر بھی وہی قابلِ قبول جو اس کے خلاف نہ جائے۔

۳۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ آخری وحی بہ تمام و کمال اس کے اندر موجود ہے۔ اس سے باہر وحی کا وجود نہیں۔ یہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور اس کے کوئی باطنی معانی نہیں۔

۴۔ یہ کتابِ عظیم شک و شبہ سے بالا ہے اور انسانی راہ نمائی کے لئے کافی اور خود مکتفی۔

ہے میری زندگی کا مقصد اور میری کاوشوں کا منتہیٰ۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہوں کی طرف سے میری ان کوششوں کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ چنانچہ، یہ مخالفت جاری ہے اور شدت سے جاری۔ لیکن میری مخالفت میں جس قدر سنگ باری مجھ پر کی جاتی ہے میں اسے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کئے چلا آ رہا ہوں۔ البتہ اس کا مجھے افسوس ضرور ہے کہ یہ حضرات اپنی اس مخالفت میں دیانت اور صداقت سے کام نہیں لے رہے ——— کذب و افترا کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور ہر قسم کے جھوٹے الزامات مجھ پر عائد کرتے ہیں۔ محض منکرِ حدیث اور منکرِ رسالت ہے۔ میں نمازوں اور نہ روزوں کا قائل ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ یہ آخر الامر نبوت کا دعویٰ کرے گا ——— یہ اور اس قسم کے غلط اور بے بنیاد الزامات و اتہامات، میں ذرا بھی حقیقت نہیں، میرے خلاف عائد کرتے رہتے ہیں۔

میرا ایمان یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم (قرآنِ مجید) تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک واحد اور ضابطۂ ہدایت ہے۔ اور رسالتِ محمدیہؐ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آئینۂ صداقت۔ اسوۂ رسولؐ اللہ، شرف و مدِ انسانیت کے لئے معیارِ کبریٰ ہے۔ اور جو نظام محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا، وہی انسانیت کی نجات و سعادت کا ضامن ہے۔ اس نظام کی بنیاد قرآنِ مجید پر تھی۔

میرا اس حقیقت پر بھی ایمان ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی، اسی نظام کی رُو سے عالم گیر اُمت بن سکے گی۔ کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ دعوےٰ ہے، جو ایک دن حقیقت بن کر سامنے آئے گا۔

قرآنِ کریم سے میں یہی سمجھا ہوں اور اسی کا عام کرنا میرا فریضۂ حیات ہے ——— وہ دن نوعِ انسان عالم گیر سعادت کا دن ہوگا جب یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ:۔

ذالک الکتٰب لاریب فیہ۔

باسمہٖ تعالیٰ

آج سب سے اہم سوال یہ ہے کہ

ہم میں کیریکٹر

کیوں نہیں

اس سوال کا اطمینان بخش جواب

پرویز

بسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیمِ

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

(پرویز صاحب کا نہایت بلیغ اور بصیرت افروز مقالہ جس کے پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہو چکے ہیں لیکن اب باقی نہیں رہے۔ احباب کے متعدد تقاضوں کے پیشِ نظر اسے نظرثانی اور حک و اضافہ کے ساتھ بارِ دگر شائع کیا جا رہا ہے۔)

آپ کسی سے بات کیجئے، اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصلِ گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں۔ پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں۔ اہلِ محلہ میں کیریکٹر نہیں۔ کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم و نسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں۔ کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض، اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصرِ حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے، اور ہر قلبِ حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی دھچکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اسی شرح و بسط اور تکرار و اصرار سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی مسل اس کے سامنے ہو اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے سابقہ الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؛ لہٰذا، سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION)

بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREN KIERKEGARRD) کے نزدیک :-

اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔

(THE PRESENT AGE)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے۔ اور

جب ظاہر (APPEARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔ (ADVENTURE OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔

خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اُٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات بگولے کا سا رقص۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

بارڈیو کے نزدیک "اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے"۔ اس کی تائید (ALEXANDAR LOVEDAY) بھی کرتا ہے۔ (TEINTER) کا قول ہے کہ :-

انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو۔ اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے :-

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHARACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟

مال صدقۂ جان

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ——— مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو ——— اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے۔ یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہو تو اُس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے ——— یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے ——— تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیئے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا ——— اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا۔۔۔۔

سول سرجن نے مریض کو دیکھا۔ مرض کی تشخیص کی۔ پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا۔ باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے نہ خرید لینا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ "کریا کرم" (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا۔ اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں جو سستا ہو اُسے اختیار کرنا۔

آپ کو بیٹے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بیوقوف تھا۔ جان کی حفاظت —— (PRESERVATION OF SELF) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر (BY INSTINCT) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ ننھی سی جان ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے راستہ میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے؛ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے تو اس میں بلندیٔ اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطح زندگی کے ایک جبلی جذبہ کا مظاہرہ ہے جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ —— جو شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اُسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقۂ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی "جان صدقۂ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آ جائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے۔ جب ان دونوں میں صرف ایک کو بچایا جا سکے تو پھر انسان کو چاہیئے کہ جان دیدے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کیلئے جان دے دیتا ہے۔ ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچالے اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصور سے آشنا تک نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسانی خصوصیت

کیریکٹر کی تعریف

ہے۔ اس کا تعلق شرفِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے جو شخص جان دے کر شرفِ انسانیت کو بچا لیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اور اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے

کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دے دینے والا، صاحبِ کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت و عصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دے دی تو اس سے عفت و عصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے۔ اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بدباطن، کسی شریف زادی کے برقعے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا۔ خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے ——— لیکن یورپ میں کوئی لڑکی

آبرو کا معیار

اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اُس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی۔ بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہردلعزیز (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ "انسانی اقدار" ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا اور ہم کسی چیز کو

مختلف اقدار ہیں

انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ لیکن ایسے قبائل بھی گذرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو چلا کر جلانے اور آرٹستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔[۱]

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلّمہ اندازِ سیاست و اجتماعیت ہے۔ اس مسلک کی رُو سے جو شخص دوسری

---

[۱] "انسان نے کیا سوچا؟" صفحہ ۱۳۴۔

قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے اسے سب سے بڑا محبِ وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ (RUMELIN) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی قوت کی نشو و نما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز ہے۔[1]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ:۔

(۱) کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا ——— لیکن

(۲) یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا، اس تصور کی رُو سے دنیا میں نہ کوئی عالم گیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے اُن اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے اس لئے اس لئے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پا جاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضیٔ مابین سے لواطت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ

یہ ایک نقطۂ نگاہ ہے۔ یعنی جب کسی بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے تو اس کا ارتکاب قابلِ نفرت اور مستوجبِ سزا ہوتا ہے۔ جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے نہ موجبِ عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرزِ معاشرت اور اندازِ بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردّ و بدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالم اخلاقیات راشڈل ...... (HASTINGS RASHDAL) کے الفاظ ہیں:۔

---

[1] "انسان نے کیا سوچا؟" صفحہ ۱۹۵۔

اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار رہے۔ جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔

(THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL II P286)

جیساکہ ہم نے اوپر کہاہے یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں براشڈل کہتا ہے:۔

اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔ (ایضاً۔ ص۳۱۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE) سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجئے۔ قرآن اسے "حیٰوۃ الدنیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پرہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی "قریب تر" کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بری چیز نہیں وہ انہیں وجہء جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی قدر" میں (TIE) پڑتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندئ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسانی قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے ......

اسے کیریکٹر کہیں گے

" یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ۔ اگر تمہیں کسی معاملہ میں گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو۔ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا۔ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جارہی ہے وہ امیر ہے یا غریب۔ قانونِ خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب پر فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد۔ رشتہ داری کے تقاضے۔ یا دولتمندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پرواہ مت کرو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔ (۴/۱۳۵) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو!.... اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔"

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (TIE) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لئے

سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہیں۔ اس کے برعکس، مفادِ خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ اگر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا۔ وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کش مکش میں جو شخص ان طبیعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے، یا شہادت دینے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ (قرآن اسے اتباعِ ہویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ ہویٰ کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے) ۔ لیکن جو شخص ان تمام امیال و عواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

اِنسان ایسا کیوں کرے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبیعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبیعی تقاضوں میں بڑی کشش و جاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی۔ عزت اور نام کی شہرت۔ بلند مناصب و مدارج۔ قوتِ اقتدار، حکومت۔ ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں، انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے۔ جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذات و حظائظ کو قربان کرے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع و لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔ ؎ وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پرواہ نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لئے کرتا ہے ——— بلکہ اس سے بھی زیادہ ——— اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا؛ وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ

؎ مفادِ خویش کا تحفظ درحقیقت جذبۂ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کی شاخ ہے۔

اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کرلے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؛ وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کرلے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آیئے کہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے۔ اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سردست انہیں چھوڑیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر "مذہب پرست*" یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے، اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اُس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لئے وجہِ طمانیت نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لئے آمادہ ہو بھی جائے تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا، اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ اگر کوئی شخص گرفتاری کے ڈر سے چوری نہیں کرتا تو اسے صاحبِ کردار نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

---

*؎ اسلام 'دین' ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا۔ لیکن اسے اب مذہب ہی سمجھا جاتا ہے۔

مفکّرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکّرینِ مغرب کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کر دیں تو مقصد پیشِ نظر کے لئے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر سے پوشیدہ نہیں ـــــ کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیرِ محض کہا جا سکے، سوائے نیک ارادے کے۔

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINITION) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ:-

وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔

یعنی ہر قسم کے افادی تصوّر سے بے نیاز ہو کر، فرض کو محض فرض سمجھ لینا کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصوّر شامل ہو جائے وہ عمل، عملِ خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عملِ خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک۔ اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادۂ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادۂ عمل کریں۔ ان کا نام۔ ان کی اصطلاح میں (A PRIORI MAXIMS) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر، فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امرِ غیر مشروط (CATEGORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

امرِ غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے "فرائض" ہونے کیلئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے (A PRIORI) کے یہی معنی ہیں)۔ اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ابھار سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے۔ انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بہت بڑے جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان "مفادِ خویش" کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا، جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ

تارک الدنیا اربابِ تصوف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو "مفادِ خویش" سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے، زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رُو سے زندگی کے دو (۲) نظریے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے، اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے اسے موت کہتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ زندگی کے مطابق انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا اور انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے رہ جاتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں کے مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین و ضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُسے پُرامن شہری کہا جاتا ہے جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے

(i) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین و ضوابط مناسب سمجھے وضع کر لے۔ اور جب چاہے ان میں تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کر لے۔

(ii) ان قوانین و ضوابط کے اتباع کے لئے جذبۂ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا

(iii) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(iv) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفادِ خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رَو میں بہہ نکلے، تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افرادِ قوم کو اس لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبۂ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گذر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصوّر ہے۔ اسے سیکولر نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب بن رہی ہیں۔

اور جی میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINITION) کی رو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ منفعت اندیشی کہیں گے، کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی اپنے ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی)۔

دوسرا تصورِ حیات

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب۔ قرآن کی رُو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ چونکہ اس کی نشو و نما کے لئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشو و نما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشو و نما، ذات کی نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات انسانی ذات کی نشو و نما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟..... آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلّت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھئے کہ وہ بیٹے کی پیدائش کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا نام و نشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے۔ اولاد کی اپنی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے

کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ——— انسان کو حیاتِ جاوید، انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

پھر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما، جسم کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو اس کے اندر مضمرِ حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کرلے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ جونہی وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، یعنی بچہ بن جاتا ہے۔ خول کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور اس کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بچہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ ذات کی نشوونما کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالم گیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصورِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں جو سیکولر تصوّرِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(i) سیکولر تصورِ حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی قوانین اور اقدار۔ لیکن

(ii) قرآنی تصورِ حیات کی رو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ایک بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

(iii) قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضہ یا مستقل اقدار کے تقاضہ) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش ذریعے کو بچانے کے لئے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سکھیا والے پلاؤ کو پھینک

دیا تھا تو ہر چند عام حالات میں کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی خاطر، ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(۱۷) قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضہ اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اور مستقل قدر کے تحفظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو، "عقلِ خود بیں" اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو، "عقلِ جہاں بیں" کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن، طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیٰوۃ الدنیا) کے مفاد، اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولو الالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفادِ خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطحِ زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے..... انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

(۱۹) جو کام عقلِ خود بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقلِ جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔ چونکہ سیکولر نقطۂ نگاہ کی رو سے طبعی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لئے ان کی زبان میں عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں کے لئے الگ الگ الفاظ ہی نہیں تھے۔ اب ماہرینِ علم النفس بلکہ علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHC ANALYSTS) نے دو الگ الگ اصطلاحات وضع کی ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسان کے طبعی تقاضوں کے حصول اور ان کی تائید میں دلائل فراہم کرے۔ وہ اسے (RATIONALISING INTELLECT) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور دوسری وہ عقل جو انسانی نفس کے حق میں دلائل فراہم کرتی ہیں وہ اسے (REASON) کہہ کر پکارتے ہیں۔ اقبالؒ نے ان کے لئے پہلے ہی دو اصطلاحات وضع کر دی تھیں۔ اوّل الذکر کے لئے "دانشِ برہانی" اور ثانی الذکر کے لئے "دانشِ نورانی"۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب تک انسان اس تصورِ حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ:-

(۱) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما

ایمان کی ضرورت

مقصودِ زندگی ہے۔

(ii) ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اُس وقت تک اُس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرفِ انسانیت سے ہے۔

راشڈلؒ لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

(ا) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلامقصود نہیں پیدا کی گئی۔ بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

(۲) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

(ا) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔ یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثرانداز نہیں ہو سکتے۔

(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(۳) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال "آج" ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں۔ اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل، نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفس مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۲۰-۲۰۰)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" سے پہلے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آ جائیے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اس کا اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں ——— اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے ——— ایک کاروباری آدمی کچھ خلافِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کرے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں

آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے ——— وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لئے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کریگا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال و بہرکیف زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے "مفادِ خویش" کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اِس وقت اس کا جذبۂ محرکہ بھی "مفادِ خویش" ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مَفاد میں فرق کرتا ہے۔

مفاد اور مَفاد میں فرق

وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لئے کم فائدے سے صرفِ نظر کرکے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا "حکم" ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا ——— جس طرح زہر آلود پلاؤ کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا ——— اسے قرآن کی رو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک، مردِ مومن، حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صِلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ مَاسَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ (۱۰/۷۲) سے یہی مراد ہے[1]۔ عمل کوئی بھی ہو وہ بلاصلہ یا بلامعاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں۔ اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ (قرآنِ کریم نے انسانی

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ۔ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی بھی، خوشگوار اور آخری زندگی بھی خوشگوار۔

ذات کی نشو و نما کا یہ طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کرکے اپنی ضروریات کے مطابق کمالے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو کمیونسٹ ممالک میں ہمیشہ آرہی ہے۔

روس کی مشکل

اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ:۔

(i) انسانی ذات کی نشو و نما مقصودِ حیات ہے۔ اور

(ii) ذات کی نشو و نما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر تڑپ ہوتی ہے۔ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہو تاکہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے۔ اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے تو وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں۔ اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح ماں کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق

یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ہر حیوانی ماں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو انسانی ماں کرتی ہے لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام

عملی طریق

افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فردِ معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔ معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں[1]) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہوگا اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے ..... نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصورِ حیات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضروریات

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دیدے۔ یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصورِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصورِ حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں)۔ حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصورِ حیات کی رُو سے مادی مفاد

نیشنلزم کا جذبہ

سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ زیادہ سے زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار کر، افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریۂ جمہوریت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبۂ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آگئی تو قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی۔ اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ کسی انسانی

---

[1] وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔
ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے۔ تحفظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظِ خویش کے لئے لاینفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظِ خویش کے لئے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص، کشتی میں بیٹھا ہوا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہٰذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقل مند کہا جائے گا)۔ صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کود جائے۔ اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس و شعور بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کمیونزم یا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو اس لئے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کا تحفظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت و استحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

مردِ مومن کا جذبۂ تحفظِ وطن

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبۂ تحفظِ وطن اور ایک مومن کے جذبۂ تحفظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؛ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ و تنفید کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہو جاتا

ہے۔ جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مملکتِ پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ اس میں ایسا نظامِ زندگی قائم کیا جائے جس سے افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشو و نما ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مملکت کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس سے اگر طبعی مفاد (سیاسی، معاشی وغیرہ مفادات) حاصل ہوتے تھے تو وہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہو سکتا تھا جن کا زاویۂ نگاہ قرآن ہو یعنی جو انسانی ذات اور اس کی نشو و نما کو اپنی زندگی اور اس مملکت کا مقصود و منتہیٰ سمجھیں۔ مملکت کے اقتدار کا اس پارٹی یا اُس پارٹی کے ہاتھ میں ہونے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مملکت کا اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کو زندگی کا مقصد! اگر ایسا نہیں تو حکومتوں کی تبدیلی اور پارٹیوں کے ردّ و بدل سے وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا جس کیلئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وہ حضرات ہوں گے جنہیں صاحبِ کردار (کیریکٹر والے لوگ) کہا جائے گا اور انہی کے برسرِ اقتدار آنے سے معاشرہ کی ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ یہ چیز مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے جو راہنما برسرِ اقتدار آتے رہے ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ و رسم تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری موجودہ قوم جیسی تھی سو تھی۔ اس کے ذمے تو صرف یہ فریضہ عائد کیا جائے کہ اس خطۂ زمین کو محفوظ رکھیں۔ لیکن آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ قرآنی تصورِ حیات ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس طرح وہ ایک مثالی صاحبِ کردار قوم بن کر ابھرے۔ مجھ سے اتفاق تو ان سب نے کیا لیکن (افسوس کہ) عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔ ہار تھک کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ (محدود پیمانے پر ہی سہی) جو کچھ مجھ سے بن پڑے مجھے خود ہی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آج سے دس بارہ سال قبل ایک ایسی درسگاہ کے قیام کا مقصد بنایا گیا جس میں یونیورسٹی کے نصاب کے ساتھ قرآنی تصورات کو پیوست کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنے کا تھا۔ زمینداروں سے اپنے طور پر زمین خریدنے کا پہلا معاملہ ہی فریب انگیز ثابت ہوا تو حکومت سے درخواست کی گئی کہ ہمیں قیمتاً زمین (ACQUIRE) کر دے۔ اس کیلئے قریب چار لاکھ روپیہ حکومت کے خزانۂ عامرہ میں جمع کرایا گیا۔ یہ اسکیم اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ درسگاہ (کالج) کے بجائے قرآنک ریسرچ سنٹر قائم کر لیا جائے جس میں فارغ التحصیل طلباء کی تربیت اس نہج پر کی جائے۔ خدا خدا کر کے حکومت کے قواعد و ضوابط کے مراحل طے ہوئے اور زمین کا قبضہ ملنے میں چند ماہ باقی تھے کہ (سابق چیف منسٹر پنجاب) نواب صادق حسین قریشی کو وہ رقبہ پسند آ گیا لیکن چونکہ قاعدے کی رو سے وہ اس زمین کو حاصل نہیں کر سکتے تھے، ہماری ساری اسکیم ہی منسوخ قرار دے دی گئی۔ ہم نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ڈیڑھ سال کی طویل مدت کے بعد (حال ہی میں) اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا لیکن قریشی صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت کے لئے درخواست گذران دی ہے۔ ان سطور کی تسوید تک پوزیشن یہ ہے۔

اگر ہمیں یہ زمین مل گئی (اور چونکہ موجودہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی اجازت کا اعلان کر دیا ہے) تو میں اپنی اسکیم کے مطابق درسگاہ قائم کرنے کی کوشش کرونگا۔ اگر عمر کے اس آخری حصہ میں میری یہ آرزو پوری ہو جائے تو میں بحضور ربّ العزت سجدہ ریز ہوں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(۳ جنوری ۱۹۷۸ء)

حقائق و عبر

۱- اقبالؒ کے خلاف زیادتی

علامہ اقبالؒ نے اپنا مجموعۂ کلام خود مرتب اور (بانگِ درا کے نام سے) شائع کیا تو اس میں کئی ایسی نظمیں شامل نہ کیں جو پہلے شائع ہو چکی تھیں، اور بعض نظموں سے کچھ اشعار حذف کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ جن نظموں یا اشعار کو انہوں نے متروک کر دیا..... وہ ان کا شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے ان متروک کردہ نظموں اور شعروں کو چن چن کر تلاش کیا اور ان کے مجموعے شائع کر دیئے۔ ہم نے اس کے خلاف اسی زمانے میں احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ اپنے جس کلام کو شاعر خود حذف کر دے ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ اسے شائع کریں۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ چنانچہ وہ غلط فہمیاں اب پیدا کی جا رہی ہیں۔ "سالِ اقبالؒ" (۱۹۷۷ء) میں بہت سے مقالات ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں انہی متروک اشعار کی سند سے علامہ کی طرف عجیب و غریب عقائد اور خیالات منسوب کئے گئے ہیں، حالانکہ ان اشعار کے حذف کرنے سے، حضرتِ علامہ کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ ان عقائد اور خیالات کو ترک کر چکے تھے۔ ابھی تو ایسے لوگ موجود ہیں جو جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم ان عقائد اور خیالات کو ترک کر چکے تھے لیکن بعد میں آنے والا مؤرخ، انہی اشعار کی سند سے حضرت علامہ کی ایسی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے گا جسے دیکھ کر خود علامہ بھی پہچان نہ سکیں گے کہ وہ انہی کی تصویر ہے ——— تاریخ کو اس طرح بھی مسخ کیا جاتا ہے!

۲- سعودی عرب کی معاشرتی حالت

طلوعِ اسلام شروع سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ مجرد اسلامی قوانین کے نفاذ یا "شرعی سزاؤں" کے جاری سے نہ کوئی مملکت اسلامی ہو سکتی ہے نہ معاشرہ حقیقی معنوں میں مسلمان۔ اس کے لئے قلب و نگاہ میں تبدیلی ہونا ضروری ہے جسے قرآن کریم نفسیاتی تبدیلی کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت ان سزاؤں کے نفاذ کا بڑی شدت سے مطالبہ کئے جاتی ہے۔ اس مطالبہ کی تائید میں وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ سعودی عرب میں ان سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جرائم ختم ہو گئے ہیں۔ ہم سعودی عرب کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے کہ ——— جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار مجلہ ایشیا کا یکم جنوری ۱۹۷۸ء کا پرچہ ہمارے سامنے آ گیا جس میں عنوانِ بالا کے تحت، محمد امین ریاض صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے ——— اس کے متعلقہ اقتباسات ملاحظہ

فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں :-

اصولی طور پر سمجھ لینے کی بات ہے کہ اسلامی قوانین کا اجراء اگرچہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کام کے بطریقِ احسن نبھ جانے کے لئے ایک عرصہ، محنتِ شاقہ اور بڑے تدبر کی ضرورت ہے۔ لیکن مجرد اسلامی قوانین کے اجراء سے اسلامی انقلاب نہیں آ جائے گا۔ اگر اسلامی نظام و قانون نافذ کرنے سے مراد اس قانونی اور اجتماعی ڈھانچے کا مہیا کرنا ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو تو یہ قطعاً لازمی نہیں ہے کہ اس ڈھانچے کے مہیا ہو جانے کے ساتھ ہی معاشرے میں وہ انقلاب بھی برپا ہو جائے اور وہ تبدیلیاں رونما ہو جائیں جو اسلام کا مطلوبِ حقیقی ہیں کہ لوگ نیک اور متقی ہو جائیں۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ پر عمل ہر سو نظر آنے لگے۔ چوریاں اور قتل ختم ہو جائیں گے، یا ہر طرف دودھ کی نہریں بہیں گی۔ اس کی جیتی جاگتی مثال سعودی عرب کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس ملک میں اجتماعی اور قانونی ڈھانچہ الحمد للہ ابھی تک اسلام کی اساس پر ہے لیکن تجربے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اسلامی انقلاب کی جتنی ضرورت سعودی عرب کو ہے شاید پاکستان کو بھی نہیں۔ کیونکہ اس قانونی ڈھانچے کے باوجود یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دوسری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سعودی معاشرے کے تنزل کی داستان محض زیبِ داستان کے لئے نہیں ہے بلکہ چند سال کے گہرے مشاہدے کی بنا پر میں نے یہ بات کہنے کی جرأت کی ہے۔ اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے اور بے ساختہ ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں کہ اے ربِ ذوالجلال اس سرزمین کو ہر شر سے محفوظ فرما جسے کہ اسے تیرے جل شانہٗ اور تیرے حبیب صلعم کے گھر سے نسبت ہے۔ آمین۔ یہ انحطاط پذیر سعودی معاشرہ اس حقیقت کی موجودگی میں کہ یہاں قوانین کی اساس اسلام پر ہے، ہر کسی کے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود ہے۔ ذہن اس بات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ انحطاط اگر رک سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ قرآن (یہاں غالباً ایک لفظ مٹا ہوا ہے۔ طلوعِ اسلام) کی روشنی سے عوام کے قلوب کو منور کیا جائے عمل پر ابھارنے کے لئے ان پر بہیم محنت کی جائے۔

اس کے بعد لکھا ہے :-

اسلام میں اصل مقصود قانون کو تبدیل کرنے سے زیادہ انسانوں کو تبدیل کرنا ہے اور یہ تبدیلی ڈنڈے کے زور سے پیدا نہیں ہوتی، قلوب اور اذہان میں انقلاب سے ہی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھنا چاہے تو ڈنڈے کے زور سے اسے نماز کا عادی نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اس کے برعکس جو نماز پڑھنا چاہتا ہے وہ شیروں کی کچھار اور تختہ دار پر بھی نماز سے غافل نہ ہو گا۔ لہٰذا حقیقی اور پائیدار تبدیلی اوپر کے بجائے نیچے سے ہی ممکن ہے۔ اوپر سے آنے والی تبدیلی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے اور نیچے سے آنے والی تبدیلی یاد رہیں جان لڑا کر سرفراز ہوتی ہے، ہاتھوں میں اٹھے جام ٹوٹتے ہیں، شراب گلیوں میں بہتی ہے، خود حاضر ہو کر اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ملاحظہ فرما لیا آپ نے اس معاشرہ کا نقشہ جس میں (ہماری مذہبی پیشوائیت کے قول کے مطابق) اسلامی قوانین منزہ شکل میں نافذ اور شرعی سزائیں شدت سے جاری ہیں!

۳ - پاکستان قائم کرنے کا گناہ

جمعیت علماء پاکستان کے سینئر نائب صدر، سید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ:-

پی این اے عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکتی۔ کیونکہ اس کے لیڈروں کے قول و فعل میں واضح تضاد موجود ہے۔ اب تک جمعیت پی این اے کے صدر اور این ڈی پی کے لیڈروں کے ساتھ ملک کے بہترین مفاد میں تعاون کرتی رہی ہے۔ ان لیڈروں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ملک میں نظامِ مصطفےٰ نافذ کرنے کے لئے کام کریں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اب بھی کانگریس کے سرپرست ہیں مولانا مفتی محمود نے خود پی این اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ انہوں نے مارشل لاء حکام پر زور دیا کہ جن لوگوں نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور نظامِ مصطفےٰ کے علمبردار ہیں ان کی کانفرنس طلب کی جائے۔ اور ملک کو موجودہ بحران سے نکالنے کے لئے ان کی مدد حاصل کی جائے۔

(روزنامہ مشرق - مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

۴ - نظامِ مصطفےٰ کی اصطلاح کے خلاف

نظامِ مصطفےٰ کی اصطلاح کے متعلق جو کچھ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۸ء (صفحہ) میں لکھا گیا تھا، اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ ہم نے کہا تھا:-

اس سلسلہ میں (ضمناً) ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں آجکل "نظامِ مصطفےٰ" کی اصطلاح رائج ہو رہی ہے۔ اگر اس سے مراد ہے دینِ خداوندی کا وہ عملی نظام جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا، تو پھر اس میں اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن اگر اس میں نظام کا لفظ خود دین کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، تو قرآنِ کریم کی رو سے، یہ درست نہیں۔ قرآنِ کریم میں اسلام کو دین اللہ کہا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، دین خدا کی طرف سے ملتا تھا جسے حضرات انبیاء کرامؑ دنیا میں رائج کرتے تھے۔ دین، خود کسی رسول کا وضع کردہ نہیں ہوتا تھا۔ مستشرقین نے اسلام کے لئے ____ (MOHAMMADANISM) اور مسلمانوں کے لئے (MOHAMMADANS) کی اصطلاحات وضع کیں۔ چونکہ ان سے اسلام کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس لئے انہیں کافی تگ و تاز کے بعد بدلوایا گیا۔ چونکہ "نظامِ مصطفےٰ" کی اصطلاح سے، اسی قسم کی غلط فہمی

پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بجائے دینِ خداوندی یا قرآنی نظام کہنا بہتر ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس باب میں کیا کہا جا رہا ہے۔ مؤقر جریدہ "الاعتصام" کی اشاعت بابت ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر ہے:۔

تفصیلات میں جانا اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ مقصد یہ گذارش کرنا ہے کہ سالہا سال کی اس طویل مدت میں "صحیح اسلامی حکومت کو قرآنی نظام"۔ "اسلامی نظام"۔ "نفاذِ شریعت"۔ "حکومتِ الٰہیہ"۔ "خلافتِ الٰہیہ"۔ "اللہ کا قانون" سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ پاکستان بنانے کے لئے جو نعرہ عوام کو دیا گیا تھا وہ بھی یہ تھا۔ "پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الا اللہ"۔

لیکن معلوم نہیں اس کا پس منظر کیا ہے کہ ان معروف اصطلاحوں کی بجائے اب کچھ عرصے سے ایک نئی اصطلاح "نظامِ مصطفیٰ" مخصوص ذہن کے ایک طبقے نے چلا دی ہے جس کے متعلق خود یہ اعتراف اس کے مؤجد کر رہے کہ یہ ہماری اپنی ایجاد ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی چند ماہ قبل جب بھٹو ازم کے خلاف ملک گیر ہنگامے پر تحریک چل رہی تھی تو پروپیگنڈے کے زور پر یہ اصطلاح خوب چلی اور اختلاف و نزاع سے بچنے کے لئے عوام و خواص میں اس کا عام استعمال ہوتا رہا۔ لیکن اب جبکہ حالات کچھ معمول پر آئے ہیں تو بعض وسیع المطالعہ اہلِ فکر نے اس پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ ملک کے نامور قانون دان مسٹر اے کے بروہی نے کہا ہے کہ چونکہ "نظامِ مصطفیٰ" کی اصطلاح بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے اس لئے اس کی بجائے "نظامِ الٰہی" کہا جانا چاہیئے۔ اس پر اس اصطلاح کے موجد اور ان کا حلقۂ ارادت چیں بہ جبیں ہو رہا ہے اور اس کو غلط مفہوم پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات یہ درست ہے اور سنجیدگی سے غور و فکر کی مستحق۔

"نظامِ مصطفیٰ" کی اصطلاح اس معنی میں درست سہی کہ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ ہی اس کے پیامبرِ اوّل اور اوّلین داعی تھے۔ اس وجہ سے آپ کے لائے ہوئے نظامِ اسلام کو "نظامِ مصطفیٰ" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی اصطلاح مبہم ذو معنی اور غلط فہمی کا موجب بنتی نظر آتی ہو تو اس سے احتراز کا حکم ہے جیسا کہ صحابہؓ کو "راعِنا" کہنے سے روک دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس سے یہود غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اس اصطلاح میں بھی خرابی کے پہلو ہیں۔ مثلاً غیر مسلم (مغربی اور عیسائی مستشرقین) اسے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ یہ تاثر دیتے آئے ہیں کہ یہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے، خود محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (معاذ اللہ) تصنیف ہے اور یوں وہ اسلام کو دینِ الٰہی کے بجائے دینِ محمدی اور آسمانی مذہب کے بجائے انسانی مذہب باور کراتے ہیں۔ اسی لئے وہ اسلام کو اسلام نہیں بلکہ محمڈن ازم لکھتے ہیں اور پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معنی میں بانیٔ اسلام کہتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بروہی صاحب کی رائے درست ہے یہ اصطلاح واقعی دشمنانِ اسلام کے

نقطۂ نظر کے فروغ کا باعث بن سکتی ہے جو اس کو اپنے مخصوص اور مکروہ پروپیگنڈے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ بنابریں اسلام کے لئے اسلامی نظام، شریعتِ اسلامیہ اور خلافتِ اسلامیہ ہی موزوں ترنام ہیں اور یہی اصطلاحات تحریر و تقریر میں استعمال ہونی چاہئیں، جیساکہ مدتوں سے یہی اصطلاحات زبان زدِ خاص و عام چلی آ رہی ہیں۔

ہمیں تعجب ہے کہ قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے اس اصطلاح کی منظوری کیسے دے دی، جبکہ اس میں کئی بالغ نظر حضرات بھی موجود ہوں گے۔

۵۔ عبدالولی خان صاحب اور وحدتِ فکر

خان عبدالولی خان صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں (جو ہفت روزہ، اسلامی جمہوریہ، بابت ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۷ء لغایت ۳ر جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے) فرمایا:-

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں استحکام کیوں نہیں آتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ بنیادی خرابی کیا ہے؟ یہ سر جوڑنے کی بات ہے۔ جھگڑا کرسی کا نہیں۔ قوم میں وحدت کا ہے۔ وحدتِ عمل پیدا کی جائے۔ لیکن وحدتِ عمل، وحدتِ فکر سے آئے گی۔

بجا اور درست۔ لیکن محترم خان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اُس فکر کی اساس کیا ہے جس کی وحدت سے قوم میں وحدتِ عمل پیدا ہو سکے گی۔ یہی اصل سوال ہے جس کی کوئی تشریح خان صاحب نے نہیں فرمائی۔

۶۔ اِس عہد کا سب سے بڑا انسان

ایشیا، بابت ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۷ء میں جماعتِ اسلامی کی ایک تقریب کی روئداد شائع ہوئی ہے، جس میں کہا گیا ہے:-

سورج افق کو چھوڑ رہا تھا کہ سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب اس عہد کے سب سے بڑے انسان، سید ابوالاعلیٰ مودودی، دعائیہ کلمات ادا کریں گے۔

مودودی صاحب کو اس سے پہلے امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مماثل۔ امام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ۔ اور اللہ کا شاہکار قرار دیا جا چکا ہے۔ اب انہیں "اس عہد کا سب سے بڑا انسان" بتایا گیا ہے۔ ("اس عہد کا" محض تکلفاً کہا گیا ہے) ——— آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! وہ لوگ بھی تو ہیں جو اپنے مقتداؤں کو خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔

۷۔ شاتمِ رسولؐ اور نظامِ مصطفٰےؐ!

بریلوی فرقہ کے راہنما اور جمعیت العلماء۔ پاکستان کے صدر، مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک تقریر کا حسبِ ذیل اقتباس غور طلب ہے۔ اسے ہم "ہمعصر ایشیا" (بابت ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کے حوالہ سے نقل کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔

ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ مَیں اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب، یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ اکتوبر ۷۷ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کیلئے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد ان سے رکھوایا جائے، تو جب اُن سے باتیں ہو رہی تھیں انہوں نے یہ فرمایا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے، آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے۔ قید کے ان لمحات میں رواداری و وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ مَیں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہوگئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے، آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں ہم میں الحمدللہ بڑی وسعتِ قلبی ہے لیکن گستاخِ رسولؐ کیلئے کوئی وسعت نہیں ہم میں رواداری ہے لیکن حضورِ پُرنور کی شان میں تنقیص کرنے والے کیلئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلسنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتوے موجود ہیں اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے ہم الحمدللہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو کسی شاتمِ رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور مَیں نے کہا۔ جنابِ والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں، ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ ملّا جو چار چار ٹکے کے ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ اطلاع غلط ملی ہے، آپ غلطی پر ہیں ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخدلی اور وسعتِ قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتمِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی۔ اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہونگے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی، علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رخ ان سے دوسری طرف، اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں۔

نورانی صاحب کو ان کا عقیدہ مبارک! لیکن ہم ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ جن "گستاخانِ رسولؐ" اور "شاتمانِ رسولؐ" کے پیچھے نماز پڑھنا آپ حرام سمجھتے ہیں، انہی کے ساتھ مل کر "نظامِ مصطفٰےؐ" قائم کرنے کی کوششیں آپ کے نزدیک کس طرح جائز قرار پا سکتی ہیں؟ کیا دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ "شاتمانِ رسولؐ" نے نظامِ مصطفٰےؐ قائم کیا ہو، اور اگر یہ نظام قائم ہو گیا تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس میں آپ اکیلے ہوں گے اور اکثریت انہیں "شاتمانِ رسولؐ" کی ہوگی! کیا نظامِ مصطفٰےؐ ایسا ہی ہوتا ہے؟

غور کیجئے کہ نظامِ مصطفٰےؐ کے نام پر قوم کو کتنا بڑا دھوکا دیا جا رہا ہے؛ ایک فدائیِ مصطفٰےؐ وہ تھا جس نے بحضورِ رب العزت درخواست کی تھی کہ:-

بپایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا — حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

اور ایک "شیدائیانِ مصطفٰےؐ" یہ ہیں جو "شاتمانِ مصطفٰےؐ" کی باہوں میں باہیں ڈال کر، نظامِ مصطفٰےؐ کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ چشمِ فلک حیران ہے کہ اس دور کی میکیاولی سیاست نے بھی کیا کیا سین دکھلاتے ہیں!!